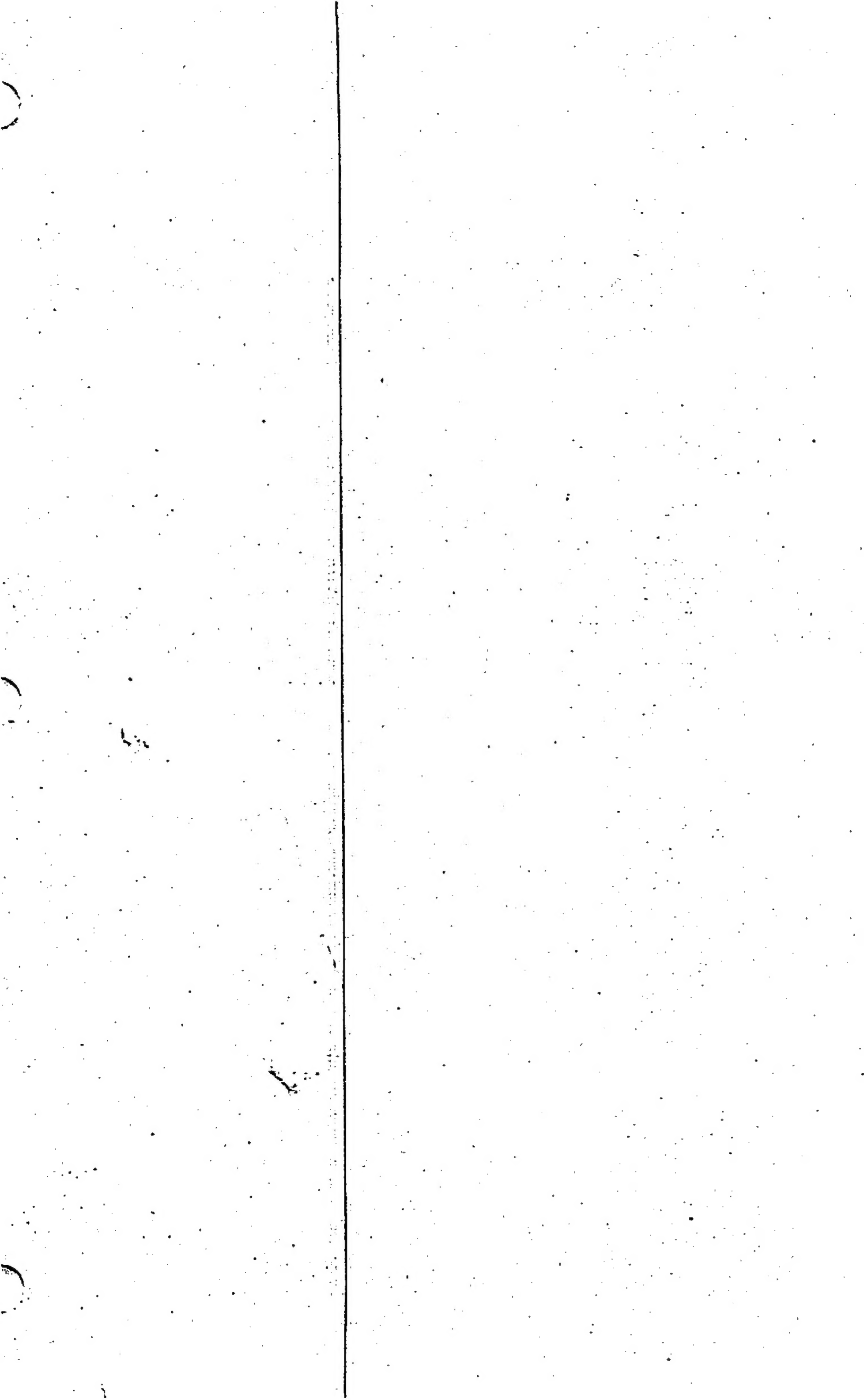
الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

جو لوگ جنگ کی باتیں کرتے ہیں وہ صرف
یہ ثابت کر رہے ہیں کہ
انھوں نے امن کی طاقت کو دریافت نہیں کیا

فروری ۱۹۹۴ ، شمارہ ۲۰۷

Rs. 6



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

فروری ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۷

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

رمضان کا روزہ

دہلی کے ایک مسلمان تاجر جناب محمد عثمان صاحب سے ۲۹ نومبر ۱۹۹۲ کو ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ روزہ ہر قسم کی ایمرجنسی کا سامنا کرنے کی تربیت ہے۔ روزہ کی اس تشریح کی تصدیق ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر کے اصل معنی ہیں رک جانا۔ صبر کا لفظ جزع کا نقیض ہے۔ الجوہری نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے جزع کے وقت اپنے آپ کو تھامنا (الصبر حبس النفس عند الجزع)

زندگی میں ہمیشہ خلافِ مزاج باتیں پیش آتی ہیں۔ زندگی نام ہے ناموافق باتوں کا سامنا کرتے ہوئے سفرِ حیات طے کرنے کا۔ جو آدمی جتنا زیادہ بامقصد اور جتنا زیادہ با اصول ہو اتنا ہی زیادہ اس کو اپنی پسند کے خلاف چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس صفت کی ضرورت دنیوی معاملات میں بھی پیش آتی ہے اور دینی معاملات میں بھی۔ روزہ اسی قسم کی صابرانہ زندگی کی تربیت ہے۔ روزہ میں آدمی کے معمولات ٹوٹتے ہیں۔ وقت پر کھانا اور وقت پر سونا اس کو میسر نہیں آتا۔ مسلسل ایک مہینہ تک اس کو بھوک، پیاس، بے خوابی جیسے تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ طبیعت کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے اس کے اندر جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر اس پر بھی اس کو صبر کرلینا پڑتا ہے۔

برداشت کی اس زندگی کو خود اپنے ارادہ سے اختیار کرنے کا نام روزہ ہے۔ لوگ مجبورانہ صبر کرتے ہیں، روزہ دار اختیارانہ صبر کرتا ہے۔ جن چیزوں کو لوگ دباؤ کے تحت چھوڑتے ہیں، روزہ دار ان چیزوں کو اصول کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ جس صابرانہ روش کو لوگ ذاتی مفاد کے لیے اختیار کرتے ہیں، اس صابرانہ روش کو روزہ دار خدا کی مرضی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کا صبر اگر اپنی ذات کے لیے ہے تو مومن کا صبر خداوند ذوالجلال کے لیے۔ روزہ ایک بے روح رسم نہیں، وہ ایک زندہ تربیت ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں جو آدمی اس کورس کو صحیح طور پر مکمل کرے وہ اس کے بعد پورے سال کے لیے ایک ایسا انسان بن جائے گا جو ہنگامی حالات میں بھی معتدل زندگی گزارے، جو بے صبری کے مواقع پر بھی صابر انسان بنا رہے۔

مسئلہ یہاں ہے

اسپین کے جنوب مشرقی کنارے پر جہاں اٹلانٹک سمندر اور میڈیٹرینین سمندر ملتے ہیں، ایک پہاڑ ہے جو جبرالٹر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اسلامی فوج کے مشہور سردار طارق بن زیاد کے نام پر ہے۔ اس کے بارہ میں تاریخ میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ جبرالٹر کا نام عربی لفظ جبل الطارق سے لیا گیا ہے۔ یہ طارق بن زیاد کے اعزاز میں تھا جس نے ۷۱۱ء میں اس کو مسخر کیا تھا:

Its name is derived from the Arabic Jabal Tariq (Mt. Tarik) honouring Tariq ibn Ziyad, who captured the peninsula in AD 711. (8/156)

اب ایک اور پہاڑ کا قصہ دیکھئے جو اس کے تقریباً ساڑھے گیارہ سو سال بعد پیش آیا، یہ اس پہاڑ کی بات ہے جو ماونٹ ایورسٹ کے نام سے مشہور ہے۔ انڈیا کی سرحد پر واقع اس پہاڑی چوٹی کے بارہ میں قدیم انسان کو کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۵۲ء میں پہلی بار ایک انگریز افسر نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ کرہ ارض کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ چنانچہ اس دریافت کے تیرہ سال بعد مذکورہ انگریز سر جارج ایورسٹ کے نام پر اس پہاڑ کا نام رکھا گیا۔ وہ ۱۸۳۰ سے ۱۸۴۳ تک انڈیا کا سرویر جنرل تھا:

It wasn't until 1852 that British surveyors identified it as the highest point on the planet. As a result, thirteen years later, the mountain was named after Sir George Everest, who was Surveyor General of India from 1830 to 1843.

جبل الطارق اور ماؤنٹ ایورسٹ محض دو پہاڑوں کے نام نہیں ہیں، یہ دو علامتی واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ اٹھارویں صدی میں مسلمان اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے متصف تھے، اس لیے پہاڑ کی چوٹیوں پر ان کا نام لکھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں مسلمان تنزل کا شکار ہو گئے اور اعلیٰ اخلاقیات کی یہ صفت یورپی قوموں میں چلی گئی۔ چنانچہ اب پہاڑ کی چوٹیوں پر یورپی لوگوں کا نام لکھا جانے لگا۔

اس دنیا میں بڑائی کسی قوم کا نسلی حق نہیں۔ اس دنیا میں بڑائی اس کو ملتی ہے جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا ثبوت دے۔ ماضی اور حال کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

دنیا منتظر ہے

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق، اس وقت امریکہ میں دس کتابیں بہت زیادہ بکنے والی (bestseller) بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے :

The Politics of Rich and Poor, by Kevin Phillips

اس کتاب میں مصنف بتاتے ہیں کہ اس وقت امریکہ میں غیر مساویانہ آمدنی (income disparity) کا مسئلہ بہت شدت اختیار کر چکا ہے جس کو وہ دوساحلی معاشیات (bicoastal economy) کہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ایک طرف امریکہ میں ایک فی صد سپر مال دار (super rich) طبقہ ہے۔ اس کی آمدنی (\$5,50,000) ڈالر سالانہ ہے۔ دوسری طرف بقیہ لوگ ہیں جو یا تو بہت کم آمدنی پر زندگی گزارتے ہیں یا مذکورہ طبقہ کے مقروض ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آخر میں اب ہمیں ایک نئی سیاسیات (new politics) کی ضرورت ہے جو نئے امریکہ کی تعمیر کر سکے۔

یہ امریکہ کا حال ہے جو آزاد معیشت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف سوویت روس کی مثال ہے جہاں مارکسی نظریہ کے مطابق پابند معیشت یا ریاستی معیشت کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تمام ذرائع پیداوار افراد کے قبضہ سے نکال کر حکومت کے قبضہ میں دے دیے گئے۔ مگر اس تجربہ کے ستر سال بعد معلوم ہوا کہ اس نے تاریخ کی سب سے زیادہ برباد معیشت کے سوا انسانیت کو اور کہیں نہیں پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ آج روسی حکومت امریکہ اور دوسرے آزاد ملکوں سے ۲۰ بلین ڈالر قرضہ مانگ رہی ہے تاکہ وہ اپنی برباد معیشت کی دوبارہ تعمیر کر سکے۔

اس مسئلہ کا واحد حل ایک ایسا نظام ہے جو سود کے خاتمہ اور زکوٰۃ کی اقامت پر مبنی ہو۔ سود کا خاتمہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت ایک محدود طبقہ میں جمع نہ ہونے پائے۔ اور زکوٰۃ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت کی گردش کسی سماج کے دونوں معاشی ساحلوں پر جاری رہے۔ مگر مسلمانوں کی نادانیوں نے لوگوں کی نظر میں اسلام کو ایک تخریبی نظریہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ آج کی دنیا یہ سوچ نہیں سکتی کہ اسلام کے پاس کوئی ایسا تعمیری نظریہ بھی ہو سکتا ہے جو وہ آج کی دنیا کو دے سکے۔

فطرت انسانی

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت کے شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ میں ایک خبر چار سطری سرخیوں کے ساتھ چھپی ہے۔ اس میں بہت سبق ہے۔ وہ خبر نوائے وقت کے الفاظ میں یہ ہے:

سابق سوویت یونین کے تین جنگی قیدیوں نے رہائی کے بعد افغانستان سے اپنے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ افغانستان میں ہی قیام کرنا چاہتے ہیں۔ ان جنگی قیدیوں کو افغانستان کے وزیر اعظم گلبدین حکمت یار اور روسی وزیر خارجہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بعد پہلے مرحلے میں رہائی ملی۔ بی بی سی کے مطابق ان تین قیدیوں میں سے ایک کا تعلق یوکرائن اور دو کا تعلق روس سے ہے۔ رہائی پانے والے ان مذکورہ افراد کا کہنا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور اسلام کی محبت سے معمور ہو کر اپنی باقی زندگی افغانستان میں ہی گزارنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس فیصلہ سے افغانستان میں روس کے ناظم الامور کو آگاہ کر دیا ہے۔ جنھوں نے گزشتہ روز شمالی افغانستان میں ان سے ملاقات کی۔ روسی ناظم الامور اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود انھیں وطن واپس جانے پر قائل نہ کر سکے۔ اس مرحلہ پر روس کے ناظم الامور نے افغان وزیر اعظم حکمتیار سے بھی وائرلیس پر بات کی لیکن افغان وزیر اعظم نے انھیں جواب دیا کہ رہائی پانے والے قیدی اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں گے۔ رہائی پانے والے روسی قیدیوں کا کہنا ہے کہ قید کے دوران ان سے قیدیوں والا نہیں بلکہ مجاہدین گروپوں کے ارکان جیسا سلوک کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ حکمت یار گروپ کی قید میں رہے۔ افغانستان میں سابق سوویت یونین کے مزید ۸۰ جنگی قیدی موجود ہیں۔

اس خبر پر غور کیجئے۔ جب تک روسی فوج اور افغانی فوج میں جنگ ہو رہی تھی، دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر جب دونوں کے درمیان لڑائی بند ہو گئی اور امن کے حالات میں دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملا تو دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے، حتیٰ کہ روسی فوجی نے اسلام قبول کر لیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اسی دین فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ کوئی آدمی صرف غیر معتدل حالات میں ہی اپنی فطرت سے بیگانہ ہو سکتا ہے۔ حالات میں اعتدال آتے ہی ہر آدمی اپنی فطرت کو پہچان لے گا اور فطری دین کو اپنا دین بنا لے گا۔

ابدی امکان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو امور کائنات کا نظم کر رہا ہے، اور وہ اللہ ہی ہے جو اپنے پیغمبروں کے اوپر اپنی آیتیں نازل کرتا ہے (یدبر الامر یفصل الآیات) الرعد ۲

اس سے معلوم ہوا کہ کائناتی واقعات، مثلاً زمین کی گردش یا بارش کا برسنا، خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بھی خدا کے حکم کے تحت ہیں۔ دونوں ہی خدائی مقدرات ہیں۔ کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ وہ زمین و آسمان کے نظام میں تبدیلی پیدا کر دے۔ اسی طرح کوئی اس پر بھی قادر نہیں کہ وہ حیات انسانی کے بارہ میں خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین کو بدل دے۔

حیات انسانی کے بارہ میں قرآن میں جو قوانین بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہاں مسائل ہی مسائل ہوں، اور مواقع کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوگا کہ جہاں کچھ مشکل ہوگی وہیں آسانیاں بھی اسی کے ساتھ ضرور موجود رہیں گی (فان مع العسر یسرا۔ ان مع العسر یسرا) الانشراح

کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، اس پر قادر نہیں کہ وہ آپ کے اوپر صبح کے آنے کو روک دے۔ رات کے بعد ضرور صبح آئے گی اور آپ کے گھر کے اوپر اس کی روشنی پھیل کر رہے گی۔ اسی طرح کسی کے بس میں یہ بھی نہیں کہ وہ آپ کو ایسی مشکل میں ڈال دے کہ اس کے بعد آسانی کی کوئی صورت آپ کے لیے باقی ہی نہ رہے۔ یہ خدائی مقدرات میں سے ہے کہ مشکلات راہ کے ساتھ عین اسی وقت مواقع کار بھی آپ کے لیے موجود رہیں۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک محکم قانون ہے، اور اس کو بدل دینا کسی بھی شخص یا گروہ کے لیے کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو آدمی خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اس کو اس نظام خداوندی پر بھی محکم یقین رکھنا ہے کہ اس دنیا میں اس کے لیے راہیں کبھی بند نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے اس دنیا میں امید کا پہلو ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور جب خدا نے امید کے پہلو کو اتنا زیادہ یقینی بنا دیا ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے مایوسی کو حرام قرار دے دے۔

دعوتی تدبیر

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔ واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم

(۴۱ : ۳۳ - ۳۶)

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہوگیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ والا ہے۔ اور اگر شیطان تمہارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگو بیشک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں الحسنۃ سے قول توحید مراد لیا ہے۔ انھوں نے کہا : الحسنۃ لا الہ الا اللہ والسیئۃ الشرک (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۵/۳۶۱)

اس تفسیر کی روشنی میں آیت کی تشریح کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سب سے بہتر تحریک وہ ہے جو دعوت الی اللہ کی بنیاد پر اٹھے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطل مفروضات کی بنا پر تم سے دشمنی کرنے لگے تو اس کو تم اپنا دشمن نہ سمجھ لو۔ تمہارے اور اس کے درمیان پھر بھی ایک قرابت ہے، اور وہ یکساں فطرت کی قرابت ہے۔ اس کی باطل روش کو نظر انداز کرتے ہوئے تم اس کے سامنے اپنی دعوت حق پیش کرتے رہو۔ اس کے بعد عین ممکن ہے کہ اس کا ظاہری پردہ ہٹ جائے اور وہ تمہارے عقیدہ کو اپنا کر تمہارا قریبی دوست بن جائے۔

مگر یاد رکھو، دشمن کو دوست بنانے کی اس تدبیر کو زیر عمل لانے کی ایک لازمی شرط ہے، اور وہ صبر ہے۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی سے تمہارے اندر مخالفانہ جذبات پیدا ہوں تو اس کو شیطان کی کارفرمائی سمجھو اور قول احسن کے رویہ پر ہر حال میں قائم رہو۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ حوصلہ کی بات ہے۔ مگر اس دنیا میں بڑا حوصلہ رکھنے والے لوگ ہی بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صلح بہتر ہے

اسلام کا عام مزاج یہ ہے کہ اختلافی معاملات میں ٹکراؤ کے بجائے موافقت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کو مختصر اور جامع لفظ میں الصلح خیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مزاج عام انسانی تعلقات سے لے کر شوہر اور بیوی تک کے تعلقات میں مطلوب ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وإن امرأة خافت من بعلها نشوزا او اعراضا فلا جناح عليهما ان يصلحا بينهما صلحا والصلح خير واحضرت الانفس الشح وان تحسنوا و تتقوا فان الله كان بما تعملون خبيرا (النساء ۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔

مرد و عورت یا دو آدمیوں کے درمیان تعلقات بگڑنے کا سبب اکثر حالات میں تنگدلی ہوتا ہے۔ ایک عورت یا مرد کو جتنا سلوک کسی سے مل رہا ہے اس پر وہ قانع نہیں ہوتا بلکہ اس سے زیادہ کی طلب کرنے لگتا ہے۔ اس سے دونوں کے درمیان بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے قطع تعلق تک پہنچ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہدایت کی گئی کہ دونوں ایک دوسرے کی رعایت کرنا سیکھیں، اور جب آپس میں کوئی اختلاف یا شکایت پیدا ہو تو اس کو بڑھانے کے بجائے اس کو گھٹائیں، وہ ایک دوسرے کے حریف نہ بنیں بلکہ آپس میں صلح کر کے معاملہ کو ختم کردیں۔ معاملات میں صلح کرلینا ہر حال میں بہتر ہے، خواہ وہ کسی بھی قیمت پر حاصل ہو۔

الصلح خیر کا یہ اصول صرف شوہر اور بیوی کے اختلافی معاملات کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام اختلافی معاملات کے لیے ہے۔ جب بھی دو شخصوں یا دو گروہوں کے درمیان جھگڑے کی کوئی صورت پیدا ہو تو ہر جگہ اسی بنیادی اصول کو رہنما بنانا ہے۔ صلح ہمیشہ کسر و انکسار یا لو اور دو کے طریقہ پر ہوتی ہے۔ اس لیے صلح کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اکڑنے کا طریقہ چھوڑ دو اور نرمی اور جھکاؤ والا انداز اختیار کرو۔

عقل سے کام نہ لینا

ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون - ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (الانفال ۲۱-۲۲)

(اے ایمان والو) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے، گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

قرآن کی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے، جو داڑھی نہیں رکھتے، جو ملی تشخص کو اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو حق کو سننے کے لیے بہرے بنے ہوئے ہیں، جن کے سامنے حق کی بات آتی ہے مگر اس کو وہ اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اس کو اس طرح لیتے ہیں جیسے کہ انھوں نے اس کو نہ سنا اور نہ سمجھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اندھاپن یا بے عقلی ایک ایسا جرم ہے جو نماز اور داڑھی اور ملی تشخص کو چھوڑنے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فہم و تدبر انسان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ اسی بنیاد پر اس کو دوسری مخلوقات پر نوعی امتیاز حاصل ہوا ہے۔ جو آدمی فہم و تدبر کھو دے اس نے گویا اپنی خصوصیت بشری کو کھو دیا۔ اور جو مخلوق اپنی نوعی خصوصیت کو کھو دے اس کے بعد عین فطری ہے کہ وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے۔

"لا یعقلون" سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے سامنے سچائی لائی جائے مگر وہ اس کو اہمیت نہ دے سکے۔ وہ اس کو الٹے مفہوم میں لے کر اسے نظر انداز کر دے۔ وہ اس کو کمتر قرار دے کر اس کا مذاق اڑائے۔ وہ عقل کو استعمال کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ فوری تاثر کے تحت اس پر غیر متعلق رائے زنی کرنے لگے۔ اس کا ردعمل بے عقلی کا ردعمل ہو نہ کہ عقل کا ردعمل۔

ایسے لوگ اعتراف کی لذت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی روح صرف کثیف چیزوں کا ادراک کرتی ہے۔ لطیف چیزوں کو اپنی خوراک بنانے کی صلاحیت ان کے اندر باقی نہیں رہتی۔

تاریخ کا سبق

۷۵۰ء میں عباسیوں نے بنو امیہ سے خلافت چھین لی اور عباسی خلافت کی بنیاد ڈالی۔ عباسی لیڈر یہ کام صرف اپنی طاقت سے نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی مدد لی۔ ایرانیوں کی مدد سے بنو امیہ کی سلطنت ختم ہوئی اور بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی۔ انھوں نے دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔

ایرانیوں سے مدد لینا صرف ایک وقتی معاملہ یا سادہ واقعہ نہیں تھا۔ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ مسلم سماج اور مسلم سیاست دونوں میں ایرانیوں کا نفوذ بہت بڑھ گیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی تعریب (Arabicization) کے اصول پر چل رہی تھی، اس کے جلو میں اسلامائزیشن کا عمل جاری تھا۔ مگر عباسی اقتدار میں ایرانیوں کے زیر اثر تفریس (Persianization) کا عمل جاری ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار مسائل پیدا ہو گئے جس کے گہرے اثرات آج تک باقی ہیں

ایک مورخ کے الفاظ میں، عباسیوں کے ماتحت اسلامی خلافت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔ بنو امیہ کے زمانہ میں توجہ کا مرکز مغرب، شمالی افریقہ، میڈیٹرینین اور جنوبی یورپ تھا، مگر اب اسلامی خلافت نے اپنی توجہ مشرق کی طرف موڑ دی :

Under the Abbasids the caliphate entered a new phase. Instead of focussing, as the Umayyads had done, on the West - on North Africa, the Mediterranean, and relations with southern Europe - the caliphate now turned eastward. (I/7)

اس معاملہ کی سنگینی اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب یہ سوچا جائے کہ عباسی خلفاء اگر بنو امیہ کے خلاف اپنی مہم میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے تو اسلامی تاریخ میں اس شاندار باب کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا جس کو "مسلم اسپین" کہا جاتا ہے۔

عباسی خلفاء نے نہ صرف یہ کیا کہ مغربی ممالک کی طرف اپنی توجہ کم کر دی۔ بلکہ وہ ان امویوں کے جانی دشمن بن گئے جو ان سے پہلے یہ کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اموی خاندان یا اموی سلطنت سے تعلق رکھنے والے ایک ایک شخص کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اموی دور میں اگر اسپین کی

طرف پیش قدمی شروع نہ ہو چکی ہوتی اور اموی شہزادہ عبد الرحمٰن الداخل اگر جان بچا کر اسپین پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا ہوتا تو اسلامی تاریخ میں مسلم اسپین اور یورپ میں اسلام کے داخلہ کا باب شاید سرے سے حذف ہو جاتا۔

یہی معاملہ ایک اور صورت میں ہندستان میں پیش آیا۔ مغل بادشاہ ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ ۱۵۴۰ سے لے کر ۱۵۵۵ تک وہ دہلی کے تخت سے محروم رہا۔ اس دوران وہ بھاگ کر ایران پہنچا اور وہاں شاہ تہماسپ سے مدد مانگی۔ ایرانی بادشاہ نے ایک بڑی فوج اور ضروری سامان اس کے حوالے کیا۔ اس طرح ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے از سرِ نو دہلی کے تخت پر قبضہ کیا۔ ۱۵ سال کے وقفہ کے بعد مغل سلطنت دوبارہ دہلی میں قائم ہوئی۔

مگر دوبارہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے نظام میں ایران کے سیاسی اور تہذیبی اثرات داخل ہو گئے۔ ایرانی اس وقت آرٹ اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ایران سے آرٹسٹ، پینٹر، نقاش اور شاعر قسم کے لوگ بڑی تعداد میں ہندستان آنے لگے۔ ہندستان کا مسلم سماج گہرے طور پر اس سے متاثر ہوا، اور ایرانی تہذیب کے رنگ میں رنگ گیا (17/132)

تاریخ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ سبق یہ کہ جب آپ کسی سے مدد لے کر کامیابی حاصل کریں تو وہ کامیابی صرف آپ کی کامیابی نہیں ہوگی بلکہ اس میں اس شخص یا گروہ کا بھی دخل ہو جائے گا جس کی مدد سے آپ نے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ ہزار کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس انجام سے نہیں بچا سکتے۔

ایسی حالت میں کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو کام کیا جائے خود اپنی بنیاد پر کیا جائے۔ زیادہ بڑے کام کا شوق نہ کیا جائے بلکہ چھوٹی سطح پر کام شروع کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی کچی کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔

حقیقی کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ بتدریج ہے، چھلانگ نہیں۔

انسان کی طاقت

بمبئی کے ایک ۱۸ سالہ مسیحی نوجوان نے خودکشی کرلی۔ اس کا نام گرین ویل گومس (Greenwell Gomes) تھا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، اس سال اس نے ایچ ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا، اب وہ بی کام میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کو بتایا گیا کہ پندرہ ہزار روپیہ "عطیہ" دیے بغیر اس کا داخلہ نہیں ہوسکتا۔ گومس کے ذہن کو اس سے بہت سخت جھٹکا لگا۔ یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں اس نے خودکشی کرلی (روزنامہ ہندستان۔ بمبئی، جولائی ۱۹۹۳)

دوسری طرف اسی ملک میں ایک اور مثال موجود ہے۔ ایک شخص کو اپنے بیٹے کے علاج کے لیے اچھے اسپتال میں داخلہ نہیں ملا۔ صرف اس لیے کہ اچھے اسپتال کی قیمت ادا کرنے کے لیے اس کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ اس آدمی نے طے کیا کہ میں خود ایک ایسا اسپتال کھولوں گا جو اچھا بھی ہوگا، اور اسی کے ساتھ اس میں داخلہ سے کوئی شخص اس لیے محروم نہیں رہے گا کہ وہ اس کی فیس نہیں ادا کرسکتا تھا۔ وہ اس مہم میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایسا ایک اسپتال قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ اسپتال آج کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ہزاروں لوگ اس سے معالجاتی فائدہ حاصل کرچکے ہیں۔

اس طرح کے فیصلہ کن مواقع ہر شخص کی زندگی میں آتے ہیں۔ اس وقت اس کا ذہن جس طرف مڑ جائے، بس اسی طرف وہ چلنے لگتا ہے۔ ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کو ایسا تعمیری رہنما مل جائے جو اس کو منفی سمت میں مڑنے سے بچا سکے۔ جو اس کو وہاں فکری سہارا دے جہاں اس کا اپنا ذہن سوچنے میں عاجز ثابت ہو رہا ہے۔

مذکورہ نوجوان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے تعلیمی واقعہ کو رکاوٹ کے بجائے چیلنج سمجھے۔ وہ پندرہ ہزار روپیہ کا عطیہ مانگنے والوں سے کہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم میرا راستہ روک سکتے ہو تو تم بہت بڑی بھول میں مبتلا ہو۔ تم انسان کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو۔ ایک انسان کی طاقت اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی اس کی زندگی میں حائل ہوسکے۔ کوئی اس کو آگے بڑھنے سے روک دے۔

اس کے بعد وہ نوجوان یہ طے کرتا کہ میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ کھولوں گا جہاں نوجوان طالب علموں کو عطیہ یا رشوت دیے بغیر داخلہ مل سکتا ہو۔ اگر وہ اس قسم کا فیصلہ کرکے اس کو اپنی زندگی کا مشن بنالیتا اور استقلال کے ساتھ اس مہم میں لگ جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ ایک نیا شاندار تعلیمی ادارہ بنانے میں کامیاب ہو جائے جہاں عطیہ کے بغیر صرف میرٹ کی بنیاد پر داخلہ دیا جاتا ہو۔

اس دنیا میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب بے حوصلگی ہے اور کامیابی کا سب سے بڑا راز حوصلہ مندی۔ مذکورہ نوجوان کی خودکشی کا سبب یہ تھا کہ وہ بے ہمت ہوگیا۔ اگر وہ بے ہمت نہ ہوتا۔ اور نئے تعلیمی ادارہ کے قیام کو اپنا مشن بنالیتا تو وہ دیکھتا کہ اسی دنیا میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کی حمایت کریں، جو اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں۔ پہلے تجربہ میں بظاہر وہ اکیلا ہوگیا تھا، مگر دوسرے تجربہ میں وہ اکیلا نہ رہتا۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے کہ :

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

یہ شعر دہلی میں سب سے پہلے مجھے ایک تاجر نے سنایا تھا۔ وہ ایک تاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر بعض اسباب سے اس کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ بالکل اکیلا ہوگیا۔ اس کے پاس دہلی میں نہ گھر رہا اور نہ کاروبار۔

یہ حادثہ اس کے ساتھ نوجوانی کی عمر میں پیش آیا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ معمولی سامان لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ صبح سے شام تک وہ محنت کرتا۔ اس کے بعد بمشکل چند روپیہ کماتا، مگر ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود اس نے اپنی محنت جاری رکھی۔ یہاں تک کہ اس کو مددگار ملنے شروع ہو گئے۔

کسی تاجر نے اس کو ادھار مال دینا شروع کیا۔ کسی نے اس کو ایک دکان دلوادی۔ کسی نے گھر حاصل کرنے میں مدد کی۔ اس طرح وہ ایک کے بعد ایک زندگی کے زینے طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دہلی کا ایک کامیاب تاجر بن گیا۔

آدمی اگر مستقل مزاجی کے ساتھ ایک راستہ کو پکڑ لے۔ اور اسی کے ساتھ وہ بااصول اور باکردار بھی ہو تو ایک نہ ایک دن وہ کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روکنے والی نہیں۔

اچھا کردار

وہ کیا چیز ہے جو کسی سماج کو اچھا سماج بناتی ہے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے افراد کا اچھا کردار۔ جس سماج کے افراد میں اچھا کردار ہو وہ سماج اچھا سماج ہوگا، اور جس سماج کے افراد میں برا کردار ہو وہ سماج برا سماج بن جائے گا۔

اچھا کردار کون سا ہوتا ہے اور برا کردار کون سا۔ اس کی پہچان بہت آسان ہے۔ اچھے کردار والا انسان وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے جو اس کو خود اپنے لیے پسند ہے۔ اور برے کردار والا انسان وہ ہے جو اپنے لیے کچھ اور پسند کرے اور جب دوسرے کا معاملہ ہو تو وہ کچھ اور پسند کرنے لگے۔

ایک آدمی اپنے گھر سے نکل کر بازار میں گیا۔ وہاں کسی نے اس سے کڑوا بول بول دیا۔ آدمی کو کڑوا بول سن کر غصہ آگیا۔ وہ اس سے لڑنے لگا۔ اس کے بعد جب یہ آدمی اپنے گھر اور محلہ میں آیا تو وہ خود بھی گھر والوں سے اور محلہ والوں سے کڑوا بول بولنے لگا۔ حالانکہ اس کو اس تجربہ کے بعد سوچنا چاہیے تھا کہ کڑوا بول جب مجھ کو اچھا نہیں لگا تو دوسروں کو بھی وہ اچھا نہیں لگے گا۔ اگر میں اپنے بارہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھ سے میٹھا بول بولیں تو مجھے خود بھی ایسا بن جانا چاہیے کہ دوسرے لوگوں کو مجھ سے صرف میٹھا بول سننے کو ملے۔

انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے درمیان مل جل کر زندگی گزارے۔ سب کی کامیابی میں ایک کی کامیابی ہے اور سب کی بربادی میں ایک کی بربادی۔ آدمی جب دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو گویا کہ وہ سماج میں ایسا ماحول بنا رہا ہے اور ایسی روایات قائم کر رہا ہے جبکہ دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی اس کو اچھے سلوک کا تحفہ دیا جائے۔

ایک آدمی جب جھوٹ بولے تو گویا کہ وہ دوسروں کو بھی جھوٹ بولنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایک آدمی جب دوسرے کی چیز ہڑپ کر لے تو وہ اپنے اس عمل سے سماج میں ناجائز قبضہ کی روایت قائم کر رہا ہے۔ ایک آدمی جب وعدہ کرے اور وقت آنے پر وعدہ کو توڑ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے سارے سماج کو وعدہ توڑنے پر جری کر دیا۔

سماجی زندگی کا رخ متعین کرنے کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز روایت ہے۔ سماجی زندگی ہمیشہ روایات پر چلتی ہے۔ اچھی روایت قائم کی جائے تو اچھا سماجی ماحول بنے گا۔ اور بری روایت قائم کی جائے تو برا سماجی ماحول پرورش پائے گا۔

اس طرح آدمی کا ہر عمل کسی نہ کسی طور پر خود اس کی اپنی طرف واپس آتا ہے۔ آدمی کے اچھے کردار سے سماج میں اچھی روایتیں قائم ہوں گی جس کا نتیجہ خود اس کو بھی مختلف صورتوں میں ملے گا۔ اسی طرح آدمی کے برے کردار سے سماج میں بری روایتیں قائم ہوں گی۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ ایسا ہوگا کہ اس کے اثرات مختلف صورتوں میں خود اس کی اپنی ذات تک بھی پہنچیں گے۔

اچھے کردار کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کی اپنی روح کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ سماج ایک اچھا سماج بن جاتا ہے جس میں اسے رہنا ہے۔ اسی طرح برے کردار کا پہلا نقصان یہ ہے کہ آدمی روحانی سکون سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اس کو رہنے کے لیے ایک ایسا سماج ملتا ہے جو جھاڑ جھنکاڑ کا سماج ہو۔ پہلی صورت میں اس کا سماج پھولوں کا سماج بن جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا سماج کانٹوں کا سماج۔

ایک آدمی نے مجھ سے سوال کیا کہ مختصر طور پر یہ بتائیے کہ دنیا میں آدمی کو کس طرح رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آپ بھی اسی طرح رہنے لگیں جس طرح آپ کے گردوپیش کی ساری دنیا رہ رہی ہے۔ کائناتی اخلاق ہی بہترین انسانی اخلاق بھی ہے۔ کائنات گویا ایک اخلاقی نمونہ ہے اور ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اس نمونہ کو ہم اپنی زندگی میں بھی اپنا لیں۔

آپ سورج کو دیکھئے۔ وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کو روشنی پہنچا رہا ہے۔ اس کے پاس ایک قوم کے لیے بھی روشنی ہے اور دوسری قوم کے لیے بھی روشنی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی سورج کو گالی دے تب بھی اس کو سورج کی طرف سے روشنی اور حرارت ہی کا تحفہ ملے گا۔

یہی آفتابی اخلاق ہمیں بھی اپنی زندگی میں اپنانا ہے۔ ہمیں ہر ایک کے لیے نفع بخش بننا ہے۔ ہمیں ہر ایک کے لیے دینے والا بننا ہے، خواہ اس کی طرف سے ہمیں کچھ مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔ اس معاملہ میں ہمارا اخلاقی معیار اتنا اونچا ہونا چاہیے کہ ہم دشمن کو بھی دوست کی نظر سے دیکھیں اور غیر کے ساتھ بھی اپنوں جیسا سلوک کریں۔

آپ درخت کو دیکھئے۔ درخت کیا کرتا ہے۔ آپ کی سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو وہ لے لیتا ہے۔ اس کے بدلے وہ آکسیجن نکالتا ہے جو آپ کی تندرستی اور توانائی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ گویا کہ درخت ایک ایسا کارخانہ ہے جس کے اندر مضر چیز داخل ہو کر بھی صحت بخش چیز بن جاتی ہے۔

اب آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ اسی اخلاق کو اپنائے۔ اس کے کان میں کڑوا بول داخل ہو تو اندر پہنچ کر اس میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ وہ منہ سے میٹھے بول کی صورت میں نکلے۔ کوئی اس کو گالی دے تو اس کے بدلے وہ اس کے لیے نیک دعائیں کرے۔ کوئی اس کو نقصان پہنچائے تو وہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرے۔ کوئی اس کو ذلیل کرے تو وہ اس کو عزت دینے کی فکر کرنے لگے۔

کائنات میں یہی معاملہ ہر چیز کا ہے۔ یہاں تک کہ زہریلے جانوروں کا بھی۔ گجرات میں ایک ڈاکٹر ہیں۔ وہ کئی قسم کے سانپ پالے ہوئے ہیں۔ وہ ان سانپوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، آپ کو ان زہریلے سانپوں سے ڈر نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ بالکل نہیں۔ کیوں کہ یہ جانور تو قابل پیشین گوئی کردار کے حامل ہیں۔ وہ صرف اس وقت آپ کو کاٹتے ہیں جب کہ آپ انھیں ستائیں۔ اگر آپ جانوروں کو دکھ نہ دیں تو وہ کبھی آپ کو دکھ دینے والے نہیں۔

اسی طرح آدمی کو بھی قابل پیشین گوئی کردار والا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو پیشگی طور پر معلوم ہو کہ آپ کسی کو دھوکا دینے والے نہیں ہیں۔ آپ امانت میں خیانت کرنے والے نہیں ہیں۔ آپ کبھی اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہیں کریں گے۔ آپ کسی کی کمزوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ آپ اپنے بارے میں ہمیشہ اس امید کو پورا کریں گے کہ آپ جب انسان ہیں تو آپ ہمیشہ انسانی کردار پر قائم رہیں گے۔ کسی بھی حال میں آپ انسانی روش سے ہٹنے والے نہیں۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲ ستمبر اور ۹ ستمبر ۱۹۹۳ کو نشر کی گئی۔

بھیڑ یا اتحاد

انسانی نفسیات کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ محبت کے مقابلہ میں نفرت کا جذبہ زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ اس کے اندر جوڑنے کی طاقت بھی زیادہ ہے۔ انسانیت سے محبت کرنے والے شاذ و نادر ہی باہم جڑتے ہیں مگر نفرت کرنے والے ہمیشہ آپس میں جُڑ جاتے ہیں۔ کسی شخص یا کسی گروہ سے مشترک نفرت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو موثر طور پر باہم جوڑتی ہو :

Hate is in every way a much stronger passion than love. It is also a much stronger binding force. Lovers of humanity rarely bind themselves together, haters invariably do so. Nothing unites a people more effectively than a common hatred for someone or some other community.

ہندستان کی بڑی بڑی تنظیمیں اس قول کی مصداق ہیں، خواہ وہ ہندو تنظیمیں ہوں یا مسلم تنظیمیں۔ یہ تمام تنظیمیں کسی مفروضہ دشمن کے خلاف نفرت کے جذبہ پر بنی ہیں۔ اگر ان سب کا ایک مشترک نام دینا ہو تو ان کا صحیح ترین نام ہوگا —— دوسروں سے نفرت کرنے والی تنظیمیں :

Organisations of haters of other communities

موجودہ زمانہ میں بار بار مسلمانوں کا "بے نظیر اتحاد" وجود میں آیا ہے۔ مگر یہ تمام اتحاد نفرت کی زمین پر قائم ہوا ہے نہ کہ محبت کی زمین پر۔ جدید دور میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں کا "ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گیا۔ مگر ایسا ہر واقعہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف نفرت کے جذبہ کو ابھار کر حاصل کیا گیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمان غیر اقوام کے لیے محبت و خیر خواہی کی پکار پر بڑی تعداد میں اکٹھا ہو گئے ہوں۔

ہمارا ایک پرجوش لیڈر اٹھتا ہے۔ وہ جذباتی تقریریں کرکے مسلمانوں کو ایک غیر قوم کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اس طرح وہ بہت جلد مسلم عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد فخر کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ "بے نظیر اسلامی اتحاد" ظہور میں آگیا ہے۔ مگر یہ سب سے بڑا دھوکا ہے جس میں موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انبوہ کا زیادہ صحیح نام بے نظیر بھیڑ ہے نہ کہ بے نظیر اتحاد۔

سنجیدگی شرط ہے

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے،
لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا
کثیرا (الاحزاب ۲۱) امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

قرآن کی اس آیت میں اللہ کے رسولؐ کو لوگوں کے لیے بہترین نمونہ بتایا گیا ہے۔ بظاہر یہ نمونہ قرآن اور حدیث اور سیرت کی کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے رسول میں اس شخص کو اپنے لیے نمونہ ملے گا جو قرآن و حدیث اور سیرت کی کتابوں کو پڑھے بلکہ یہ فرمایا کہ یہ نمونہ جو پورے معنوں میں بہترین نمونہ ہے، وہ صرف اس شخص کو ملے گا جو اللہ سے ڈرے، جو آخرت کے لیے فکر مند ہو، جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا نمونہ جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے وہ کوئی ریاضیاتی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ مثلاً کسی کتاب میں لکھا ہوا ہو کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں، تو جو آدمی بھی اس کو کتاب میں پڑھے گا وہ اس کا ایک ہی مطلب نکالے گا۔ اس کو سمجھنے میں غلطی کرنے یا بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں۔ مگر سیرت رسول کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ہمیشہ مختلف تعبیرات کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لیے اس کو صحیح طور پر اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پوری طرح سنجیدہ ہو۔ ذہن پر اللہ کا تصور چھایا ہوا ہونا اور آخرت کے دن سے ڈرتے رہنا آدمی کے اندر یہی سنجیدگی پیدا کرتا ہے، اس لیے ایسا آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کے نمونہ کو صحیح طور پر اخذ کر سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہؐ کا نمونہ قرآن اور حدیث اور سیرت میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر وہ دو اور دو چار کی طرح کوئی حسابی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ اور انسان کی زندگی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ وہ مختلف احوال سے گزرتی ہے۔ اس میں کبھی ایک قسم کی صورت حال پیش آتی ہے اور کبھی دوسرے قسم کی صورت حال۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں مختلف قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ کبھی آپ

دشمنوں کی مخالفانہ حرکتوں کو برداشت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کبھی آپ کو حکومت پیش کی جاتی ہے مگر آپ اس کو قبول نہیں کرتے اور کبھی خود حکومت قائم کرتے ہیں۔ کبھی آپ صرف ایمان اور اخلاق کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی ایسے احکام بیان کرتے ہیں جن کا تعلق سیاست اور اجتماعی قانون سے ہوتا ہے۔ کبھی آپ آخرت کے مسئلہ پر اس طرح زور دیتے ہیں جیسے کہ وہی سب کچھ ہے اور کبھی دنیوی تدبیروں کی اہمیت بتاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کا فرق واختلاف آپ کے نمونہ کو تعبیر کی نوعیت ایک چیز بنا دیتا ہے۔ آپ کے نمونہ سے ہدایت لینے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق جانے۔ وہ ایک حالت میں اور دوسری حالت میں تمیز کر سکے۔ وہ اس حکمت سے آگاہ ہو کہ کب کون سا اسوہ مطلوب ہے اور کب کون سا اسوہ مطلوب ہے۔

اسی کا نام تعبیر صحیح ہے۔ اور اس تعبیر صحیح کی استعداد آدمی کے اندر صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ خوف خدا اور فکر آخرت نے اس کو انتہائی حد تک سنجیدہ بنا دیا ہو۔ جو آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ ایک موقع کی بات کو دوسرے موقع پر چسپاں کر دے گا۔ وہ اس فکری غلطی کا ارتکاب کرے گا جس کو وضع الشیئ فی غیر موضعہ کہا گیا ہے۔ وہ اس عوامی کہاوت کا مصداق بن جائے گا کہ ——

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

جس آدمی کے اندر گہری سنجیدگی اور شدید احتیاط کی مذکورہ صفت موجود نہ ہو وہ تعبیر کی غلطیوں کی وادی میں بھٹکتا رہے گا، وہ اسوۂ رسول سے کبھی اپنے لیے نمونہ حاصل نہ کر سکے گا۔

ایسے شخص کا حال یہ ہوگا کہ جہاں احتساب خویش کے حکم پر عمل کرنے کی ضرورت ہو وہاں وہ انتقام غیر کی آیت کا حوالہ دے گا۔ جہاں صبر کا موقع ہو وہاں وہ جہاد کی باتیں کرے گا۔ جہاں حدیبیہ کی سنت مطلوب ہو وہاں وہ دفاع کی حدیث سنائے گا۔ جہاں غیر قوم کے ساتھ مدعو کا معاملہ کرنا ہو وہاں وہ اس کے خلاف بدر وحنین کا معرکہ گرم کرنے پر تقریر کرے گا۔ جہاں خود اپنے اندر دینی کردار پیدا کرنے کا وقت ہو وہاں وہ پیغمبر کے حاکمانہ اسوہ کو جوش وخروش کے ساتھ پیش کرے گا۔ جہاں یہ ضرورت ہو کہ اہل ایمان دعوت الی اللہ کے لیے اٹھیں وہاں وہ قتال کی آیتوں اور حدیثوں کا دفتر کھول دے گا۔

بے معنی کلام

عربی ہفت روزہ الدعوة (۲ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ، ۱۹ اگست ۱۹۹۲ء) میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: الدکتور یوسف القرضاوی یکشف خفایا المؤامرة الماسونیة (ڈکتور قرضاوی ماسونی سازش کے خفیہ رازوں کا انکشاف کرتے ہیں) موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مضامین ہزاروں کی تعداد میں چھاپے گئے ہیں۔ مسلمان آج جن مشکلات و مسائل سے دوچار ہیں ان کے بارہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ غیر اقوام کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ مسلسل دشمنانِ اسلام کی ان سازشوں کے انکشاف میں مصروف ہے۔

مخالفین کی ان سازشوں کے خلاف عالمی سطح پر جدوجہد جاری ہے۔ اس جدوجہد کے بارہ میں میں کہوں گا کہ وہ اپنا نشانہ پورا کر چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود نتیجہ بدستور صفر ہے۔ نشانہ کی تکمیل کے باوجود مسلمانوں کے مسائل ایک فی صد بھی حل نہیں ہوئے۔

سازشوں کے بارہ میں نشانہ کی تکمیل سے میری مراد سازشوں کا انکشاف ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام مسلم پریس، تمام مسلم اجتماعات، تمام مسلم لٹریچر مغربی سازشوں کے انکشاف میں مصروف ہیں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ سازش اسی وقت تک سازش ہے جب تک وہ مخفی رہے۔ سازش جب بے نقاب ہو جائے تو وہ سازش نہیں رہتی۔ پھر جب مسلم دماغوں نے مغربی سازش کی مخفی حیثیت کو ختم کر کے اسے ایک معلوم حقیقت بنا دیا تو اس کے بعد گویا انھوں نے سازش کے مقابلہ میں کامیابی بھی حاصل کر لی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سازشوں کے اوپر فکری فتح حاصل کر لینے کے باوجود ہمارے مسائل کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مغرب کی مفروضہ سازش سادہ طور پر صرف سازش نہیں تھی۔ وہ مغرب کی ترقیاتی حیثیت کا ایک استعمال تھی، وہ مغرب کی صنعتی برتری کے بطن سے پیدا ہوئی۔ ہم سازشوں کے انکشاف کے باوجود مغرب سے اس کی صنعتی برتری کو چھین نہ سکے۔ اس لیے ہم کامیاب بھی نہیں ہوئے۔

جس چیز کو ہم نے مغرب کی سازش کا معاملہ سمجھ رکھا تھا وہ درحقیقت مغرب کی ترقیاتی برتری کا معاملہ تھا۔ اور ترقیاتی برتری کے مسئلہ کو کسی سازش کے اعلان یا انکشاف کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیمی ایمپائر

ایک مجلس میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی مشن کو موثر انداز میں کام کرنے کے لیے ہمیشہ ظاہری مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں دو تحریکیں خاص طور پر کامیاب رہیں۔ ایک تبلیغی جماعت۔ اور دوسرے وہ جس کو دیوبند تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں کے پاس ایک ظاہری مرکز موجود تھا جس سے لوگ بہ آسانی وابستہ ہو سکتے تھے۔

تبلیغی تحریک ایک مبنی بر مسجد (masjid-based) تحریک کے طور پر اٹھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی اس کو ہر جگہ کام کا مرکز حاصل ہو گیا۔ کیوں کہ ہر جگہ مسجد پہلے سے موجود تھی۔ تبلیغی جماعت کو پھیلاؤ ملنے کا خاص سبب یہی ہے کہ اس نے مسجد کو بنیاد بنا کر کام کیا۔ اور اس بنا پر لوگوں کو جوڑنا اس کے لیے نہایت آسان ہو گیا۔

دیوبند تحریک مبنی بر مدرسہ (madrasa-based) تحریک تھی۔ اس کے کارکنوں کے سامنے ایک متعین کام تھا کہ وہ ہر جگہ مدرسہ بنائیں۔ مدرسہ بننے کے بعد مقامی طور پر ہی اس کو ہر قسم کے ضروری افراد مل جاتے تھے اور تحریک کو ایک محسوس مرکز حاصل ہو جاتا تھا۔

الرسالہ مشن میں علم کا پہلو غالب ہے۔ اس لیے ہمیں تعلیم گاہ کو مرکز بنا کر اس کام کو آگے بڑھانا ہے۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کو یہ کرنا ہے کہ ہر جگہ وہ یا تو کسی قائم شدہ تعلیم گاہ سے جڑ کر کام کریں، یا خود اپنے وسائل کے تحت کوئی تعلیم گاہ بنائیں۔ اس طرح ہر جگہ یہ کام ایک محسوس صورت اختیار کرے گا اور لوگوں کے لیے اس کے ساتھ جڑنا آسان ہو جائے گا۔

الرسالہ مشن ایک مبنی بر ماہنامہ (mahanama-based) تحریک کے طور پر اٹھا۔ مگر یہ کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ مبنی بر تعلیم گاہ تحریک کے طور پر چلنے لگے۔ اور لٹریچر یا ماہنامہ کی حیثیت اس کے معاون آرگن کی ہو جائے۔ اس طرح یہ مشن زیادہ پائداری کے ساتھ جاری رہ سکے گا۔

الرسالہ مشن سے وابستہ افراد جگہ جگہ یہ تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ کوئی شخص مدرسہ کی صورت میں اس کو کر رہا ہے اور کوئی اسکول کی صورت میں۔ اور کوئی مخلوط ادارہ کی صورت میں۔ ضرورت ہے کہ یہی صورت ہر جگہ قائم ہو جائے، اور پھر یہ تمام کام مزید اضافہ کے ساتھ منظم ہو جائیں۔ حتیٰ کہ یہ کام پورے ملک کی سطح پر ایک تعلیمی ایمپائر کی صورت اختیار کر لے۔

گلبرگہ کا سفر

گلبرگہ ریاست کرناٹک میں واقع ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ ۱۸۲۵ کیلومیٹر ہے۔ یہاں ایک ادارہ حزب التوحید کے نام سے قائم ہے۔ کچھ تعلیم یافتہ نوجوان اس کو چلا رہے ہیں۔ اس ادارہ کی دعوت پر گلبرگہ کا سفر ہوا۔ اس سفر کے دوران مزید حیدرآباد اور ظہیر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۴ مئی ۱۹۹۲ کی شام کو جب میں اپنے دفتر سے رخصت ہو رہا تھا، میری زبان سے نکلا: "میری مثال ایسی ہے جیسے کسی گائے کو سلاٹر ہاوس لے جایا جا رہا ہو"۔ یہ تجربہ مجھ کو ہر سفر میں پیش آتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ہر سفر دعوتی سفر ہوتا ہے۔ دعوت کی ذمہ داری سب سے زیادہ سخت ذمہ داری ہے۔ دعوت کا کام احساس عجز کے تحت ہوتا ہے نہ کہ احساس اعتماد کے ساتھ۔

واقعہ یہ ہے کہ داعی کا کام، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دنیا میں اللہ رب العالمین کی نمائندگی ہے۔ آدمی مجبور ہے کہ وہ اس مشکل کام کے لیے کھڑا ہو۔ اسی کے ساتھ وہ مجبور ہے کہ اس کی نزاکتوں کو سوچ کر تڑپ اٹھے۔ میرا حال یہ ہے کہ جب میں کسی اجتماع میں تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہوں تو اپنی عجز بیانی کا احساس اتنی شدت کے ساتھ طاری ہوتا ہے کہ اکثر میری زبان سے نکل جاتا ہے: خدایا، تو میرے لیے "پلے بیک اسپیکر" بن جا۔

ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تو فضا گرمی کی وجہ سے تپ رہی تھی۔ سارا بدن پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کے بعد جب میں دہلی ایرپورٹ کی ایرکنڈیشنڈ عمارت میں داخل ہوا تو وہاں ہر طرف ٹھنڈک تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد پسینہ خشک ہو کر جسم کو سکون حاصل ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے گرمی بھی رکھی ہے اور ٹھنڈک بھی۔ گرمی اس لیے ہے تاکہ اس کو دیکھ کر آدمی جہنم کو یاد کرے۔ اور ٹھنڈک اس لیے ہے تاکہ آدمی جب اس کا تجربہ کرے تو وہ جنت کا مشتاق بنے۔

دہلی سے حیدرآباد کے لیے فلائٹ نمبر ۸۵۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک انگریزی اور ایک ہندی اخبار دیکھا۔ انگریزی ہفت روزہ کرنٹ (۱۵ مئی ۱۹۹۲) میں ایک مفصل مضمون افغانستان کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا: کشتگان فتح (victims of victory)! اس مضمون میں

افغانی جہاد کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ افغانستان کے قبائل جو باہم معاند اور متخاصم رہتے ہیں، اسلام ان کو متحد کرنے کے لیے کافی نہیں :

Islam is not enough to unite Afghanistan's mutually antagonistic and often warring groups.

دورِ اول میں اسلام نے یہ معجزہ دکھایا کہ اس نے لڑتے ہوئے لوگوں کو آپس میں متحد کر دیا (آل عمران ۱۰۳) اس کے برعکس آج ایک جائزہ نگار کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اسلام لڑنے والے لوگوں کو متحد کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دور اول کے لوگوں نے اسلام کو اسلام کے طور پر اختیار کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں لوگ اسلام کو قومی نعرہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور جو فائدہ حقیقی اسلام سے ملتا ہو وہ فائدہ کبھی قومی نعرہ والے اسلام سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوران پرواز ہندی اخبارساندھیہ ٹائمس (۱۴ مئی ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے اُردو زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ اس شمارہ کی چند سرخیاں ملاحظہ ہوں :

کانگرس، بھاجپا اور جنتا دل میدان میں

دلوں کے خزانے لوٹنے نہیں دیے

کالازار میں ہومیو پیتھی کارگر ہے

ہر سال ساڑھے تین لاکھ مکان بنانے ہوں گے

بے قابو سٹلائٹ قابو میں

عمران نے نام واپس کیوں لیا

دلی پولیس کمال کرتی ہے

حاضر جواب نلک

بس کو اسٹاپ پر روکنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں

جو لوگ ہندی اخبارات پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی اخبارات کی زبان عام طور پر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اردو زبان اس ملک میں مٹ رہی ہے۔ زیادہ صحیح

بات یہ ہے کہ اردو زبان بدستور اس ملک میں زندہ ہے۔

آزادی کے بعد کچھ مسلم لیڈروں نے مطالبہ کیا تھا کہ دستور ہند میں یہ لکھا جائے کہ ملک کی قومی زبان ہندستانی ہوگی جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ یہ بات دستور میں تو نہ لکھی جا سکی۔ مگر تاریخی حقائق نے اس کو عملاً قائم کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ملک کی عمومی زبان ہندستانی (آسان اُردو) ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کے یہاں فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور ہندو اس کو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

جارج کاف مین (۱۹۶۱ - ۱۸۸۹) ایک امریکی ادیب اور صحافی تھا۔ اس نے لمبی عمر پائی مگر وہ کبھی ہوائی جہاز پر سوار نہیں ہوا۔ اس کا سبب اس کے الفاظ میں یہ تھا: میں محفوظ زمین (سالڈ گراؤنڈ) کو پسند کرتا ہوں۔ اور کوئی جگہ جتنی محفوظ ہو اتنا ہی وہاں ڈر کم ہوگا:

Goerge Kaufman lived a long life and almost never stepped on to a plane. His reason? "I like terra firma and the more firma, the less terra."

اس جملہ میں صنعت ایہام (pun) کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایہام سے مراد ذومعنی لفظ کا مزاحیہ استعمال ہے۔ یعنی ایسے دو لفظوں کا مزاحیہ استعمال جو تلفظ میں مشابہ مگر معنی میں مختلف ہوں۔ مذکورہ فقرہ میں آخری "ٹیرا" صوتی مشابہت کی بنا پر "ٹرر" کے مفہوم میں ہے۔ یعنی میں زمین پر رہتا ہوں، کیوں کہ زمین پر ڈر کم ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ زمین بھی ایک اڑتی ہوئی سواری ہے۔ ہوائی جہاز فضا میں اڑتا ہے اور زمین خلا میں۔ دونوں میں سے کوئی بھی ٹیرا فرما نہیں (وترى الجبال تحسبها جامدة وهى تمر مر السحاب)

اپریل ۱۹۹۲ میں نیویارک کے ایک ادارہ کی طرف سے ہفتہ ہوابازی (Aviation Week) منایا گیا۔ کمپیوٹر کی مدد سے ایک ہفتہ کے دوران دنیا کی ۴۴ ہوائی کمپنیوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ معیار، بھروسہ، پابندی اور گرمجوشی (quality, reliability, punctuality, cordiality) کے اعتبار سے ان کا کیا حال ہے۔ اس عالمی جائزہ میں انڈین ایر لائنز کو نمبر ۴۳ پر جگہ ملی۔ اس کے بعد آخری نمبر عراق ایر کا تھا (ہندستان ٹائمس ۲۵ مئی ۱۹۹۲)

ہندستان کے لیڈروں کی تقریریں سنیے تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ہندستان ساری دنیا کا قائد ہے۔ مگر عملاً صورت حال اس کے برعکس ہے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے دعوے کے اعتبار سے سب سے آگے اور حقیقت کے اعتبار سے سب سے پیچھے ہوں۔

۱۴ مئی کو جب ہمارا جہاز حیدر آباد ایرپورٹ پر اترا تو رات ہو چکی تھی۔ ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ حبیب بھائی کا مکان ایرپورٹ سے بہت قریب ہے۔ دو منٹ میں ہمارا قافلہ ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ رات اسی جگہ گزاری۔ یہ علاقہ کافی پرسکون ہے اور نئے حیدرآباد میں واقع ہے۔

پچھلے دن ایک صاحب نے بڑے زور شور کے ساتھ اپنی اس تجویز پر بحث کی تھی کہ فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ بنائیں اور ہر شہر میں پاکٹ کی صورت میں آباد ہوں۔ مگر جن لوگوں کو اس قسم کے پاکٹ کا عملاً تجربہ ہو رہا ہے وہ کبھی اس تجویز کی تائید نہیں کریں گے۔ مثلاً پرانے حیدر آباد میں عملاً مسلمانوں کا پاکٹ موجود ہے۔ جب کہ نئے حیدر آباد میں زیادہ آبادی غیر مسلموں کی ہے۔ لیکن فسادات وغیرہ کے مسائل صرف پرانے حیدر آباد میں پیش آتے ہیں۔ نیا حیدر آباد ہمیشہ اس قسم کی چیزوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۱۵ مئی کو صبح ۴ بجے حیدر آباد سے گلبرگہ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ اس سفر میں جناب جلال الدین محمد لاہوری اور محمد فصیح الدین قاضی ساتھ تھے۔ فجر کی نماز راستہ میں پڑھی گئی۔ سداسیو پیٹ میں سڑک کے کنارے ایک شاندار مسجد زیر تعمیر نظر آئی۔ اتر کر اس کو دیکھا۔ لوگوں نے بتایا کہ پہلے یہ مسجد معمولی ٹن کے شیڈ کی صورت میں تھی۔ اب اس کے رقبہ میں دگنا اضافہ کر کے کئی منزلہ پختہ مسجد بنانے کا منصوبہ ہے۔ مسجد بالکل نئے طرز کی اور خوب صورت تھی۔

ہندستان میں ایسی مسجدیں اور مدرسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج ان کی تعداد اور ان کی وسعت میں سیکڑوں گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ مگر کوئی بھی "مسجد والا" یا "مدرسہ والا" دنیا کو اس ترقی کی خبر نہیں سناتا۔ اگر اتفاق سے کسی مدرسہ کی دیوار پر ہولی کا رنگ پڑ جائے یا کسی مسجد کے سامنے سے غیر مسلموں کا جلوس باجا بجاتا ہوا گزر جائے تو اس کی خبر سنانے کے لیے ہر آدمی زبان و قلم کا شہنشاہ بن جاتا ہے۔ ان میں کوئی ایک بھی نہیں جس نے

مذکورہ ترقیاتی واقعہ سے دنیا کو باخبر کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس قسم کی خبر رسانی ناقص خبر رسانی ہے۔ اور جو لوگ ناقص خبر رسانی کی کمزوری میں مبتلا ہوں ان کا انتخاب کبھی داعیٔ حق کے مقدس منصب کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔

آگے بڑھے تو ایک مقام پر سڑک کے دونوں طرف سامان سے لدے ہوئے دو ٹرک اوندھے گرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ دونوں ٹرک آمنے سامنے سے آرہے تھے۔ مگر دونوں میں سے کوئی دوسرے کو راستہ دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ دونوں صرف ہارن بجا بجا کر دوسرے سے کہتے رہے کہ تم اپنے ٹرک کو کنارے لے جاؤ۔ کیوں کہ میں اپنے ٹرک کو ہٹانے والا نہیں۔ دو طرفہ ضد میں دونوں ٹکرا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی برباد ہو گئے۔

گرے ہوئے ٹرک کو میں نے غور سے دیکھا تو ایک ٹرک پیچھے ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی۔ اس پر جلی حرفوں میں یہ فقرہ لکھا ہوا تھا —— میرا بھارت مہان۔

میں نے سوچا کہ ان کی اس تباہی کا سبب ان کا ایک تضاد تھا۔ انھوں نے دھات کی تختی پر لکھ رکھا تھا کہ میرا دیش مہان ہے۔ مگر ان کے دل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میری گاڑی مہان ہے۔ دیش کو مہان بنانا اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعۃً دیش کو مہان بنائے ہوئے ہوتے تو وہ اپنی ذات کی نفی بھی کر چکے ہوتے۔ ایسی صورت میں مذکورہ حادثہ کا امکان اپنے آپ ختم ہو جاتا۔

ہماری کار محمد معین صاحب (۲۵ سال) چلا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کتنے دن سے گاڑی چلاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۸۵ سے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کبھی ایکسیڈنٹ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اگر آپ سڑک پر صحیح رخ سے جا رہے ہوں اور سامنے سے آنے والا غلط رخ سے آپ کی طرف آنے لگے تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا : اپنی گاڑی کو سلو کر دینا اور ضرورت ہو تو اپنے کو روک لینا۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ سڑک کے ڈرائیوروں میں تو بہت سے ایسے افراد ملیں گے جو اس راز کو جانتے ہوں۔ مگر زندگی کے مسافروں میں کوئی نہیں جو اس قیمتی راز کو جانے اور تعلقات انسانی میں اس کو استعمال کرے۔

ہم ظہیر آباد سے آگے بڑھے تو ہمارے ساتھی نے کہا: "یہاں آندھرا پردیش ختم ہوتا ہے اور

کرناٹک شروع ہوتا ہے" اس سے پہلے سڑک کے کنارے کے تمام بورڈ تلگو میں ہوا کرتے تھے۔ اب تمام بورڈ کنڑی میں دکھائی دینے لگے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے تقریباً ۵۰ فی صد مسائل زبانوں کے اختلافات کی بنا پر ہیں۔ اگر یہاں سارے ملک کی زبان ایک ہوتی، جس طرح چین اور جاپان میں ہے۔ تو ہندستان کے جھگڑے اتنی شدت کے ساتھ پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر پیدا ہوتے تو جلد ہی ختم ہو جاتے۔

سڑک کے دونوں طرف جگہ جگہ آم کے درخت نظر آئے۔ ان پر ہری ہری پتیوں کے درمیان آم کے پھل لٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ درخت پورے ایک سال تک " محنت "کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کی شاخوں پر بامعنی پھل کا ظہور ہو۔ یہاں محنت کے بغیر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا، نہ درخت کی دنیا میں اور نہ انسان کی دنیا میں۔

گلبرگہ میں میرا قیام وَردھامَن ہوٹل کے کمرہ ۱۰۶ میں تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ دیر تک کمرہ میں لائٹ نہیں تھی۔ پنکھا اور بلب دونوں بند تھے۔ میں نے کمرے کے اندر کے تمام سوئچ دبائے مگر لائٹ نہیں آئی۔ میں نے سمجھا کہ یہاں کا بجلی کا نظام خراب ہے۔ ایک صاحب حکومت کے خلاف سخت شکایت کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ایک مقامی نوجوان آئے۔ اندر کا حال دیکھ کر وہ باہر نکلے۔ اور اس کے معاً بعد کمرہ میں لائٹ آگئی۔ پنکھا بھی چلنے لگا اور بلب بھی روشن ہو گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کمرہ کے باہر دروازہ کے پاس اس کا مین سوئچ لگا ہوا تھا۔ یہ مسافر کی آسانی کے لیے تھا کہ جب وہ کمرہ سے نکلے تو ایک ہی سوئچ کے دبانے سے پورے کمرہ کی بجلی بند کر سکے۔ اس وقت کمرہ میں کئی نوجوان تھے۔ میں نے کہا کہ دیکھئے، اس میں بھی نصیحت ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ اگر آپ نے اصل "سوئچ" نہ دبائی ہو تو نہ آپ کا پنکھا چلے گا اور نہ آپ کا کمرہ روشن ہو گا۔ اس لیے بجلی نہ ہونے کی شکایت نہ کیجئے، بلکہ اصل سوئچ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کیجئے۔

مثلاً اگر آپ تعلیم میں پیچھے ہوں، آپ اقتصادیات میں پیچھے ہوں، آپ کے اندر اتحاد نہ ہو، آپ کے اندر کردار کی طاقت نہ ہو تو گویا کہ آپ کا مین سوئچ بند ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو وہ فائدہ کیوں کر مل سکتا ہے جو مین سوئچ کھلا ہونے کی صورت میں کسی کو ملتا ہے۔

گلبرگہ ریاست کرناٹک کا ایک تاریخی شہر ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں وہ دہلی سلطنت

کا ایک حصہ تھا۔ ۱۳۴۷ء سے لے کر ۱۴۲۴ء تک وہ آزاد بہمنی سلطنت کی راجدھانی رہا۔ ۱۷ویں صدی میں اورنگ زیب نے اس کو فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کیا۔ ۱۸ویں صدی میں دوبارہ وہ الگ ہو کر ریاست حیدر آباد کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۵۶ میں وہ میسور کا حصہ بنا جواب کرناٹک کہا جاتا ہے۔

گلبرگہ میں بہت سی تاریخی یادگاریں ہیں۔ یہاں بہمنی بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ یہاں کئی قدیم کالج ہیں۔ وہ کپاس اور اس سے متعلق چیزوں کی تجارت کا خاص مرکز ہے۔ محمد بن تغلق نے اس شہر کا نام احسن آباد رکھا تھا۔ مگر وہ دیر تک رائج نہ رہ سکا۔

بہمنی سلطنت محمد بن تغلق (سلطان دہلی) کے کچھ عمال کی بغاوت سے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ وہ ۱۳۴۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ بغاوت کامیاب ہو تو وہ فتح ہے، اور اگر وہ ناکام ہو جائے تو غداری۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا، اور کیسے عجیب ہیں دنیا کے معاملات۔

گلبرگہ کی سب سے ممتاز عمارت وہ سمجھی جاتی ہے جو قرطبہ کے طرز پر بنائی گئی تھی۔ اس علاقہ میں بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ سے ۱۵۱۸ تک قائم رہی۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ اسپین کی مسلم سلطنت زوال کا شکار ہوئی یہاں تک کہ ۱۴۹۲ میں وہ آخری طور پر ختم ہو گئی۔ اس زمانہ میں اسپین کے مسلم اور غیر مسلم سائنس داں وہاں کے حالات سے مایوس ہو کر یورپ کے علاقوں میں جانا شروع ہوئے۔ اس طرح سائنسی تحقیق کا کام مسلم دنیا سے مسیحی دنیا کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ مگر بہمنی حکمرانوں کو آخری چیز جو مسلم اسپین سے قابل درآمد معلوم ہوئی وہ ایک "عمارت" تھی۔ ان حکمرانوں کے اندر اگر علمی شعور ہوتا اور وہ وہاں ہونے والے سائنسی عمل کو اپنے ملک میں منتقل کرتے تو یہ ایک ایسا انقلابی کام ہوتا جو تاریخ کے رخ کو موڑ دیتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۳۵۰ - ۱۵۰۰ کے درمیان بہمنی سلطنت اور وجے نگر کے حکمرانوں میں کم از کم دس لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں سے زیادہ کا تعلق تنگ بھدرا۔ کرشنا دوآبہ پر قبضہ حاصل کرنا تھا:

The period 1350-1500 saw at least ten wars, most of which were concerned with control over the Tungabhadra-Krishna doab. (9/371)

اس علاقہ میں پانی کی کمی کی بنا پر ندی کے پانی کا جھگڑا چھ سو سال سے بھی زیادہ پہلے شروع ہوا اور اب تک بدستور جاری ہے۔ آزادی کا دور بھی اس کو ختم نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فریق اپنے

واقعی حق سے زیادہ لینا چاہتا ہے۔ اگر ہر ایک اپنے واقعی حق پر راضی ہو جائے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے۔

گلبرگہ کے قیام کے زمانہ میں رہائش گاہ اور دوسرے مقامات پر لوگ برابر اکھٹا ہوتے رہے۔ اور غیر رسمی انداز میں مسلسل گفت گو جاری رہی۔ ایک مجلس میں کچھ نوجوان اکھٹا تھے۔ میں نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جب بھی آپ کوئی بات کسی سے کہیں تو یہ سوچ کر کہیں کہ آپ کی بات سننے والے کے کان میں پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہی ہے۔ یہ احساس اگر زندہ ہو جائے تو اس کے بعد غلط کلام یا بے فائدہ کلام کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔

۱۵ مئی کی شام کو گلبرگہ کے قلعہ کی مسجد دیکھی۔ یہ ایک بہت بڑا قدیم قلعہ ہے۔ اس کا رقبہ چھ سو مربع ایکڑ بتایا گیا۔ تاہم اب وہ خستہ حالت میں ہے۔ بظاہر محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے اس کی مرمت وغیرہ نہیں کرائی جاتی۔ اس کے اندر بہت سے لوگوں نے رہائش اختیار کر لی ہے۔

قلعہ کے اندر ایک تاریخی مسجد ہے۔ یہ ۱۳۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ حسن گنگو بہمنی نے گلبرگہ کو فتح کرنے کے بعد قلعہ کے اندر یہ مسجد بنائی تھی۔ یہ مسجد جامع قرطبہ کے نقشہ پر بنائی گئی ہے۔ وہ آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ پوری مسجد میں عمدہ چونے کا پلاسٹر ہے۔ اس مسجد میں معروف طریقہ کے مطابق صحن نہیں ہے۔ پوری مسجد مسقف ہے۔ میں نے اس کے اندر چل کر اسے ناپا تو مشرق و مغرب میں وہ ۱۰۲ قدم تھی اور شمال و جنوب میں ۸۰ قدم۔ پوری مسجد میں ۱۴۰ کھمبے ہیں اور ۲۶۰ کمانوں پر اس کو کھڑا کیا گیا ہے۔ وہ زمین سے اتنی بلندی پر ہے کہ اس کے نیچے بھی ایک منزل بن سکتی ہے۔

دو آدمی ملاقات کے لیے آئے۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ جنت کو اپنا مقصد بنائیں۔ آپ شعوری طور پر سوچ سمجھ کر یہ طے کریں کہ ہم کو مرنے کے بعد جنت حاصل کرنا ہے۔

ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ جنت کو پانے کے لیے ضروری عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا تعین کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ قرآن کو صرف اس نیت سے از اول تا آخر پڑھیں کہ اس سلسلہ میں قرآن کیا راستہ بتاتا ہے۔ اور پھر جو راستہ قرآن میں ملے اس کو کسی شک اور تردد کے بغیر اختیار کر لیجئے۔ آپ انشاء اللہ سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ قرآن جنت کا بے خطا گائڈ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پہلے میں الرسالہ پڑھتا تھا، اب میں نے الرسالہ کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں چھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ تو بزدلی سکھاتا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ کوئی اقدام نہ کرو، بس چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ اس قسم کا شکست خوردہ نظریہ کیسے قبول کیا جاسکتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ الرسالہ کو چھوڑنے کے بعد آپ نے کیا کیا بہادری کے کام کیے اور کون کون سے اقدامات کیے۔ وہ کوئی ایک بھی مثال نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ بہادری کی باتیں کرنے کو بہادری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بہادری کی باتیں کرنا اور بہادری کا عمل نہ کرنا بزدلی سے بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ وہ منافقت ہے۔ اور منافقت سے زیادہ بری چیز اللہ کے نزدیک اور کوئی نہیں۔

اسی قسم کے ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ نفسیات کی اصطلاح میں، دو قسمی سوچ (dichotomous thinking) کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ آپ کے پاس سوچنے کے لیے صرف دو لفظ ہے، بزدلی اور بہادری۔ آپ حقیقت کو صرف کالا اور سفید، دوست اور دشمن، اقدام اور بے عملی جیسی دو تقسیموں کا معاملہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس سے زیادہ ہے کہ وہ اس قسم کی سادہ تقسیم میں سما سکے۔ علماء نفسیات بتاتے ہیں کہ اس طرح کی دو قسمی سوچ میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جنھوں نے تخلیقی فکر کی صلاحیت اپنے اندر سے کھودی ہو۔ ایسی سوچ آدمی کی پستی کا ثبوت ہے نہ کہ بلندی کا ثبوت۔

میں نے کہا کہ اقدام یا ٹکراؤ کے بعد دوسری حالت صرف بے عملی اور پسپائی کی نہیں ہے۔ یہاں ایک اور حالت بھی موجود ہے اور وہ وقفۂ تعمیر ہے۔ یعنی ٹکراؤ کو ختم کرکے اپنے لیے عمل کی مہلت حاصل کرنا۔ تاکہ اپنی کمیوں کو دور کرکے اپنی داخلی تیاری کو مکمل کیا جاسکے۔ اس قسم کی روش کا نام منصوبہ بندی ہے نہ کہ بزدلی۔

الرسالہ کی باتیں سادہ اور فطری ہونے کی وجہ سے لوگوں کو آسانی کے ساتھ یاد ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے قاری اکثر اس کی باتوں کو جگہ جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک کارخانہ کے منیجر صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے کارخانہ کے غیر مسلم کارکنوں کو اکثر الرسالہ کی باتیں بتاتے ہیں۔ وہ لوگ بہت تاثر کے ساتھ ان کو سنتے ہیں۔ ایک انجینیر صاحب اسی طرح اپنے ادارہ کے آدمیوں کو الرسالہ کے اقوال سناتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے ایک تربیتی اور اصلاحی ہینڈبل دیا۔ اس کو چھاپ

کر وہ بڑی تعداد میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں الرسالہ کا یہ جملہ لکھا ہوا تھا : اختلاف کے باوجود متحد ہونا ہی اتحاد ہے۔ اسی طرح مختلف مسجد اور مدرسہ میں الرسالہ کے تعمیری جملے بورڈوں پر لکھے ہوئے نظر آئے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ "ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد ہندستانی"۔ میں نے پوچھا کہ کیا صحابہ کرام نے کبھی یہ کہا تھا کہ ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد عرب۔ یا عرب کے باہر جن ملکوں میں وہ گئے وہاں انھوں نے یہ کہا کہ ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد مصری یا شامی یا ایرانی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا : پھر ایسی بولی بولنا بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے، اور ضلالت تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والی نہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی بولیاں جاہلیت کی بولیاں ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ آپ یوں کہیں کہ میں مذہب کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور وطن کے اعتبار سے ہندستانی۔ کوئی آدمی یہ نہیں کہتا کہ میں پہلے اپنے باپ کا ہوں، اس کے بعد میں اپنی ماں کا ہوں۔ آدمی بیک وقت اپنے باپ کا بھی ہے اور اپنی ماں کا بھی۔ اسی طرح آپ بیک وقت مسلمان بھی ہیں اور ہندستانی بھی۔

شہر میں چلتے ہوئے ایک بار ہم ایک عمارت سے گزرے۔ اس پر "سٹی لائبریری" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہمارے مقامی ساتھی نے کہا کہ اس لائبریری میں الرسالہ آتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اسی طرح گلبرگہ میں بہت سی لائبریریاں ہیں اور اکثر لائبریریوں میں دوسرے میگزین کے ساتھ الرسالہ بھی مطالعہ کی میز پر رکھا جاتا ہے۔

تبلیغی حلقہ کے کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں تقریباً ۲۰۰ مسجدیں ہیں اور اکثر مسجدوں میں کم وبیش تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایسے بہت سے افراد ہیں کہ ان میں سے ایک شخص لہو ولعب کی زندگی میں پڑا ہوا تھا۔ اس کو سمجھایا جاتا تھا۔ مگر وہ اپنے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ آخر کار اس کو کہہ سن کر "جماعت" میں نکالا گیا۔ چند دن جماعت میں رہ کر جب وہ لوٹا تو وہ بدل چکا تھا۔

اس طرح کے واقعات تبلیغ کے کام میں کثرت سے پیش آئے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے یہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ یہ معمولی غور وفکر سے اس کا راز سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت میں جانے

سے پہلے جو لوگ۔ انھیں سمجھاتے تھے، وہ ان کے ماحول میں رکھتے ہوئے انھیں بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور یہ عام انسانی مزاج کے خلاف ہے۔ جماعت میں نکالنا دراصل آدمی کو اس کے ماحول سے نکالنا ہے۔ آدمی سے جب اس کا ماحول چھوٹ جاتا ہے تو اس کے بعد وہ اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ وہ خالی ذہن کے ساتھ سوچ سکے۔ اس وقت اس کی فطرت کے سوا کوئی اور چیز اس کے پاس موجود نہیں ہوتی۔ اور جب فطرت کے سامنے حق کو پیش کیا جائے تو اس کے بعد اس کی قبولیت میں دیر نہیں لگتی۔

ماحول سے نکال کر اصلاح کرنے کے طریقہ کی مثالیں پیغمبروں کے یہاں موجود ہیں۔ مثلاً مصر میں بنی اسرائیل مشرک قوم کے ماحول میں تھے۔ ان کے اندر کافی بگاڑ آگیا تھا۔ اس وقت حضرت موسیٰ ان کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے گئے۔ یہ گویا ان کو ان کے ماحول سے باہر نکالنا تھا۔ چنانچہ جو تربیتی کام مصر میں نہیں ہو رہا تھا، وہ صحرا کے علاحدہ ماحول میں آسانی کے ساتھ ہونے لگا۔

میں نے کہا کہ ماحول سے نکال کر اصلاح کا یہی طریقہ غیر مسلموں کے لیے بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ اگر کچھ لوگ ایسا کریں تو وہ بہت سے غیر مسلموں کو اپنا ساتھی پائیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں۔ آخر کس سے صبر و اعراض۔ کیا ان لوگوں سے صبر و اعراض جو کفار لا اعتبار ہیں۔ میں نے کہا کہ "کفار لا اعتبار" کا لفظ مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ بہت سے لوگ اس کو قرآن و حدیث کی طرح دہراتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث تو درکنار، وہ عربی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس جملہ میں اعتبار کا لفظ ٹرسٹ کے معنی میں ہے۔ اور عربی میں اعتبار کا لفظ ٹرسٹ کے معنی میں نہیں آتا بلکہ عبرت پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اس ملک کے غیر مسلموں کو کافر کہنا سرے سے غلط اور غیر اسلامی ہے۔ کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اور کسی شخص کا منکر ہونا اس وقت متحقق ہوتا ہے جب کہ اس کے سامنے بات پوری طرح پیش کر دی جائے اور پھر بھی وہ اس کا انکار کرے۔ اس ملک کے غیر مسلموں کے سامنے ابھی مسلمانوں نے سرے سے دعوت پیش ہی نہیں کی۔ پھر پیشگی طور پر ان کو کافر (منکر) کیسے کہا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ سنتِ رسول کے مطابق صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس ملک کے غیر مسلموں کو ہم اپنا وطنی بھائی سمجھیں

اور ان کو اپنا ہم قوم کہیں۔

مزید یہ کہ دعوت لاؤڈ اسپیکر کے اعلان کا نام نہیں ہے۔ دعوت دراصل دردمندی اور خیر خواہی کے تحت کیا جانے والا ایک عمل ہے۔ اور جب آپ کسی قوم کو حریف اور رقیب سمجھ لیں تو اس کے حق میں خیر خواہی اور دردمندی کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار تحریکیں اٹھیں مگر بیشتر تحریکیں کسی نہ کسی کو رد کرنے کی بنیاد پر اٹھیں ——— رد بدعت، رد قادیانیت، رد شرک، رد شیعیت، رد عیسائیت، وغیرہ۔ یہ تمام تحریکیں عملاً بالکل بے نتیجہ رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل کام اثبات ہے نہ کہ تردید۔

۱۵ مئی کو جمعہ کے دن گلبرگہ کی جامع مسجد میں خطاب تھا۔ یہ خطاب نماز جمعہ کے بعد ہوا۔ خطاب سے پہلے ایک صاحب نے پوچھا کہ آج مسجد میں آپ کے خطاب کا موضوع کیا ہے۔ میں نے کہا کہ نماز۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ اصلاح معاشرہ پر خطاب کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔

میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میں سوچتا رہا کہ نماز کے بارہ میں لوگوں کا تصور کتنا محدود ہے۔ وہ نماز کے موضوع کو الگ سمجھتے ہیں اور اصلاح معاشرہ کے موضوع کو الگ۔ حالانکہ نماز پوری اسلامی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ نماز پوری زندگی کی اسلامی تربیت ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں اسی اعتبار سے نماز کے عمل کی تشریح کی۔

۱۵ مئی کو نماز عشاء کے بعد دوبارہ جامع مسجد میں ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر میں میں نے کہا کہ ایک ہے بے روح عبادت اور ایک ہے زندہ عبادت۔ بے روح عبادت ایک وقتی قسم کا رسمی عمل ہوتا ہے جس کا آدمی کی زندگی سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔ اور زندہ عبادت وہ ہے جو آدمی کی پوری زندگی سے جڑی ہوئی ہو۔

۱۶ مئی کو نماز فجر کے بعد کچھ لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔ یہاں ایک گھنٹہ تک دینی باتیں ہوئیں۔ یہ گفتگو زیادہ تر سوال و جواب کی صورت میں ہوئی۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہم سے کہا جاتا ہے تقدیر کے معاملات میں زیادہ بحث نہ کرو۔ بلکہ مجمل ایمان رکھو، ایسا کیوں ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب خود تقدیر کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی محدودیت کا مسئلہ ہے۔

ہم اپنی محدودیت کی بنا پر بہت سی باتوں کا ادراک نہیں کر سکتے ۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی باتوں کو مجمل طور پر مان لیا جائے ۔ یہی سائنٹفک طریقہ ہے ۔ مثال کے طور پر سائنس میں ایک مکمل کائنات پر یقین کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ بلیک ہول تھیوری بتاتی ہے کہ کائنات کے مادہ کا ۹۰ فی صد حصہ ہمارے لیے ناقابل مشاہدہ ہے ۔ کیوں کہ اس کی روشنی ہم تک نہیں پہنچتی ۔ اور ہم روشنی کے بغیر کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتے ۔

۱۵ مئی کی سہ پہر کو گلبرگہ کے دو مدرسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ۔ جامعہ عربیہ مظاہر العلوم اور مدرسہ عربیہ مصباح العلوم ۔ دونوں مدرسے تعلیم دین کی خدمت میں مصروف ہیں ۔ دونوں جگہ مختصر خطاب کیا گیا ۔ خطاب میں طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ علم کے حصول کے لیے سب سے ضروری چیز محنت ہے ۔

۱۶ مئی کی شام کو نماز عشاء کے بعد گلبرگہ کے نیشنل للی روز ہائی اسکول میں خطاب عام تھا ۔ اس کا موضوع تھا : توحید سب سے بڑی حقیقت ۔ اس خطاب میں کافی تفصیل کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالی گئی ۔ میں نے بتایا کہ توحید محض ایک کلمہ کا تلفظ نہیں ہے ، وہ عظیم ترین حقیقت کو اپنے دل و دماغ میں اتارنا ہے ۔ فرد یا معاشرہ میں جب توحید کا فکر جڑ پکڑتا ہے تو وہ شروع سے آخر تک ہر چیز کو بدل ڈالتا ہے ۔ اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ توحید کا فکر لوگوں کے ذہنوں میں ڈالا جائے ۔

۱۷ مئی کی صبح کو گلبرگہ سے حیدر آباد کے لیے روانگی ہوئی ۔ راستہ میں ظہیر آباد واقع ہے ۔ یہاں کچھ دیر قیام کر کے دار العلوم ظہیر آباد دیکھا جس کو مولانا مدثر صاحب اور ان کے ساتھی چلا رہے ہیں ۔ دنیا پرست لوگ جن کو "ملا" کہہ کر انھیں قوم کا غیر اہم عنصر قرار دیے ہوئے ہیں ، وہی اس وقت قوم کا سب سے اہم کام کر رہے ہیں ۔ یہ ہے تعلیم دین کا نظام سنبھالنا ۔ "ملا" لوگ اگر اس کام میں نہ لگتے تو یہ کام شاید معطل ہو جاتا ، کیوں کہ غیر ملا اصحاب کو اس قسم کے کام سے کوئی دل چسپی نہیں ۔

ظہیر آباد میں خطاب عام کا ایک پروگرام بھی تھا ۔ اس کا انتظام یہاں کے کمیونیٹی ہال میں کیا گیا تھا ۔ اس خطاب کا عنوان تھا ———— "اسلام میں آخرت کا تصور"

میں نے کہا کہ آخرت کا تصور کوئی رسمی قسم کا عقیدہ نہیں ۔ یہ دراصل ایک سنگین ترین حقیقت کا

اعتراف ہے جس سے ہم میں سے ہر شخص کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اگر دلوں کے اندر صحیح معنوں میں اس کا احساس و اعتراف پیدا ہو جائے تو پوری زندگی میں انقلاب آ جائے۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ اس کی اہمیت کو واضح کیا۔

ظہیر آباد کے مدرسہ میں تحفیظ القرآن کے کلاس میں بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے بچے رحل پر قرآن رکھ کر قرآن کو یاد کرنے میں مشغول تھے۔ ان سے پوچھا جاتا کہ فلاں سورہ میں کتنے رکوع اور کتنی آیتیں ہیں تو وہ فوراً بلا توقف اس کا جواب دیتے تھے۔ فلاں سورہ مکی ہے یا مدنی، یا اس قسم کے دوسرے سوالات۔ کسی آیت کا پہلا لفظ پڑھ دیجئے اور اس کے بعد بچہ اس کے آگے کی آیتیں فی الفور پڑھنے لگے گا۔ دنیا میں اس طرح کے لاکھوں مدرسے ہیں۔ اور ان میں تعلیم پانے والے بچے گویا زندہ کمپیوٹر ہیں جو قرآن کے لفظ لفظ کو محفوظ کرنے میں مشغول ہیں۔

اس منظر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ انسانیت کی تاریخ میں کئی بلین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر کسی کتاب کا مصنف اس پر قادر نہ ہو سکا کہ وہ لوگوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کر دے کہ وہ نسل در نسل اس کو یاد کرتے رہیں۔ یہ امتیاز صرف قرآن کو حاصل ہے۔ قرآن کی یہ استثنائی صفت اس کی استثنائی نوعیت کو ثابت کر رہی ہے۔

ظہیر آباد کے بیرونی مارکٹ میں ہماری گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ مولانا اکبر الدین قاسمی کچھ خریداری کے لیے یہاں اترے۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے بتایا کہ سڑک کے کنارے میں ایک ٹھیلہ والے پاس کھڑا تھا۔ وہاں ایک نوعمر مسلمان لڑکا آم بیچ رہا تھا۔ میں ابھی وہیں تھا کہ ایک اور مسلمان لڑکا اس کا جاننے والا وہاں آگیا۔

پہلے لڑکے نے دوسرے لڑکے سے پوچھا کہ کیا آج تم اسکول گئے تھے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ اس پر پہلے والے لڑکے نے کہا: نہیں پڑھے گا تو کسی چائے خانہ میں پیالیاں دھونا ہوگا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے لڑکے کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ مجھ کو دیکھ، میں وقت پر اسکول گیا۔ وہاں سے پڑھ کر آیا ہوں اور اب آم بیچ رہا ہوں۔ سنو، یہاں ہم کو پڑھنا ہے اور اچھی تعلیم حاصل کرنا ہے، تاکہ ہم کو اچھی ملازمت ملے۔ اور اگر ملازمت نہ بھی ملی تو اگر ہم نے پڑھ لیا تو ہم کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔ پڑھا ہوا آدمی ہر کام کر سکتا ہے۔ بے پڑھا آدمی کوئی کام نہیں کر سکتا۔

غریب طبقہ کے دو مسلمان لڑکوں کی یہ گفتگو میرے لیے بڑی سبق آموز تھی۔ اس کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں حال کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے مستقبل کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نظر آیا کہ اس ملک کے مسلمانوں نے اب نیا فیصلہ کیا ہے، اور اس فیصلہ کا اثر گلیوں میں رہنے والے بچوں تک پہنچا ہے۔ اب تک مسلمان اپنے سطحی لیڈروں کی باتوں میں آکر اپنے مستقبل کا معاملہ دوسروں پر ڈالے ہوئے تھے۔ وہ احتجاج اور مطالبہ کی بے فائدہ مہم میں مشغول تھے۔ اب وہ ان جھوٹے لیڈروں کے فریب سے نکل آئے ہیں۔ اب انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی تقدیر آپ بنائیں گے۔ اور جو قوم اس راز کو پالے اس کی ترقی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

ظہیر آباد میں چند گھنٹے گزار کر دوپہر کے وقت یہاں سے حیدرآباد کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک نوجوان عالم غیاث احمد رشادی سے بات ہوتی رہی۔ میں نے قرآن و حدیث کے بہت سے مضامین کو سوال و جواب کی صورت میں واضح کیا۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ میں پہلی بار قرآن و حدیث کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں ویزکیھم کہا گیا ہے۔ تزکیہ ذہن کے پردہ کو کھولنے کا نام ہے نہ کہ بند حجرہ میں بیٹھ کر الفاظ کی ورزش کرنے کا۔

ساڑھے تین بجے سہ پہر کو حیدرآباد پہنچا۔ یہاں نماز عصر کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ محبوب بازار (چادر گھاٹ) میں الرسالہ مطبوعات کی فراہمی کے لیے ایک نیا اسٹال کھولا گیا ہے۔ یہاں سے الرسالہ اور دوسری مطبوعات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ٹیلی فون نمبر یہ ہے — 527774

۷ مئی ۱۹۹۲ کو راقم الحروف کی تقریر کے ساتھ اس کا افتتاح کیا گیا۔ میں نے اپنی تقریر میں الرسالہ مشن کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کا مشن یہ ہے کہ مسلمانوں کو دوبارہ اس قائدانہ رول کے لیے کھڑا کیا جائے جو کہ ماضی میں وہ مسلسل ادا کرتے رہے ہیں۔

برطانی دور سے پہلے جب مسلمان اس ملک میں آئے تو جواہر لال نہرو کے الفاظ میں، وہ بریلینٹ کلچر لے کر اس ملک میں آئے۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اس ملک کو فائدہ پہنچایا جس کا فیاضانہ اعتراف ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر میں کیا ہے۔

انگریزی دور میں دوبارہ مسلمانوں نے یہاں قائدانہ رول ادا کیا۔ اب ضرورت تھی کہ ملک میں آزادی کی تحریک اٹھے اور اس کے لیے قربانیاں دی جائیں۔ یہ کام بھی مسلمان ہی کر سکتے تھے اور انھوں

نے اس کو انجام دیا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے پاس "جہاد" کا تصور موجود تھا، جب کہ دوسرے کسی فرقہ کے پاس جہاد کا تصور موجود نہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی جانبازیوں ہی نے دیگر فرقوں کو جدوجہد آزادی کا حوصلہ دیا۔

۱۹۴۷ کے بعد دوبارہ یہ ملک اہل اسلام کے قائدانہ رول کا انتظار کر رہا ہے۔ اکثریتی فرقہ میں ذات پات کا عقیدہ یہاں انسانی مساوات کے قیام میں مستقل رکاوٹ ہے۔ دوسرا سنگین مسئلہ لامحدود زر پرستی ہے۔ کیوں کہ زر اس ملک کا سب سے زیادہ پوجا جانے والا دیوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس چیز کو انڈین کلچر کہا جاتا ہے وہ عملاً صرف زرکلچر (money culture) ہے۔ اور ذات کلچر یا زرکلچر کبھی کسی ملک کی تعمیر میں مثبت کردار ادا نہیں کر سکتا۔

ایسی حالت میں خدائے واحد کے پرستاروں کے لیے یہاں خدمت انسانیت کا زبردست موقع ہے، وہ اٹھیں اور اپنے ہم وطنوں کو توہم پرستی کے اندھیرے سے نکال کر حقیقت پسندی کی روشنی میں لے آئیں ـــــ الرسالہ مشن مسلمانوں کو اسی عظیم خدمت کے لیے تیار کرنے کا مشن ہے۔ الرسالہ کا مشن یہ ہے کہ مسلمان دوبارہ اس ملک میں ہیرو کا کردار ادا کریں جس طرح انھوں نے ماضی میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔

اس ابتدائی تقریر کے بعد لوگ بڑی تعداد میں الرسالہ بک اسٹال پر گئے۔ اور وہاں سے کتابیں حاصل کیں۔ بہت سے لوگوں نے حاصل کردہ کتابوں پر مصنف کے آٹوگراف لیے۔

۲ مئی کو نماز عشاء کے بعد ایک عمومی اجتماع تھا۔ اس کا انتظام مدینہ ایجوکیشن سنٹر میں کیا گیا تھا۔ مسٹر کے۔ چندریہ (آئی اے ایس) اس کے صدر اور مسٹر حسن الدین احمد (آئی اے ایس) مہمان خصوصی تھے۔ یہاں میری مفصل تقریر ہوئی۔ اس تقریر کا عنوان "نیو ورلڈ آڈر اور اسلام" تھا۔ میں نے بتایا کہ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ امریکہ اپنے انٹرسٹ کا دوست نمبر ایک ہے۔ یہی معاملہ تمام دوسرے گروہوں کا ہے۔ یہ کہنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ فلاں شخص یا گروہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک اپنے انٹرسٹ کا دوست نمبر ایک ہے۔ اس دنیا میں ہر ایک اپنے انٹرسٹ کے لیے دوڑ رہا ہے۔ اس دوڑ میں اگر کسی کی طرف سے ہم کو ٹھوکر لگ جائے تو اس کا سبب دشمنی نہیں بلکہ مسابقت ہوگا۔ میں نے کہا کہ دشمنی کی اصطلاح میں سوچنا منفی ذہن

پیدا کرتا ہے اور مقابلہ و مسابقت کی اصطلاح میں سوچنا ثبت ذہن۔

اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ "اسلام خطرہ میں" ایک بے معنی لفظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تاریخ میں ایسا انقلاب آچکا ہے کہ اسلام ابدی طور پر خطرہ سے باہر چلا گیا ہے۔ دنیا کے لوگ جو بھی کارروائی کریں، حتی کہ اگر وہ اسلام کے خلاف مہم چلائیں تب بھی اس کا فائدہ اسلام ہی کو پہنچے گا۔

حیدر آباد میں میری ملاقات ایک صنعت کار جناب حبیب محمد صاحب سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جب کوئی نوجوان جاب کے لیے میرے پاس آتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے کام ہے۔ اور جو بھی سلری تمہارے دل میں ہو اس کو دینے کے لیے میں تیار ہوں۔ مگر یہ جان لو کہ مجھے مین کی نہیں، بلکہ سپر مین کی ضرورت ہے۔ اگر تم میرے یہاں کام کرو تو بار بار تمہارے سامنے ایبنارمل حالات آئیں گے۔ اس ایبنارمل کو نارمل بنانا، یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں روزگار کی کمی نہیں۔ کمی اس بات کی ہے کہ لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنے اندر وہ استعداد پیدا نہیں کرتے جو ان کو موجودہ معنوں میں ایک مفید شخصیت بنادے، اور پھر وہ کسی کے لیے "سپر مین" بن کر اس سے سپر سلری حاصل کر سکیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ فلاں صاحب نے لکھا ہے کہ الرسالہ تو محض چٹکلوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ وقت گزاری کا ایک دلچسپ ذریعہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میرے نزدیک الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا سبق نکالا جاتا ہے اور اسی لیے مجھ کو الرسالہ پسند ہے۔

میں نے کہا کہ دونوں تبصروں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ جس بات کو مذکورہ صاحب نے بھونڈے لفظوں میں کہا تھا اسی کو آپ خوب صورت لفظوں میں کہہ رہے ہیں۔ آپ دونوں صاحبان کے تبصرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ الرسالہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ بس ایک ادبی اسلوب ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ قرآنی اسلوب ہے۔ وہ ایک ایمانی نوعیت کی چیز ہے نہ کہ محض ادبی نوعیت کی چیز۔

قرآن و حدیث میں مختلف الفاظ میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ مومن وہ ہے جو واقعات کو عبرت کی نظر سے دیکھے اور ان سے نصیحت حاصل کرلے۔ اس طریقہ کے لیے قرآن میں خاص لفظ

توسّم آیا ہے (ان فی ذلک لآیات للمتوسمین) الحجر ۷۵
توسم سے مراد استدلال بالعلامات ہے (الجامع لاحکام القرآن ۱۰/۴۳) یعنی ظاہری علامت سے اندرونی حقیقت کو معلوم کرنا، اسی کو عبرت پذیری کہا جاتا ہے۔ ایک آدمی وہ ہے جو اتنا ہی جانے جتنا وہ دیکھے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو دیکھنے والی چیز کو دیکھ کر نہ دکھائی دینے والی چیز کا پتہ لگالے۔ ایسے شخص کو قرآن میں متوسّم کہا گیا ہے۔ الرسالہ درحقیقت لوگوں کے اندر توسم کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اسی توسم سے وہ ربانی فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ "لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی اس دنیا میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے۔" میں نے کہا کہ لمحہ بہ لمحہ تبدیلی کی کوئی مثال دیجئے۔ وہ کوئی مثال نہ دے سکے۔ میں نے کہا کہ جب بھی آپ اس قسم کا کوئی بیان دیں تو پہلے یہ سوچ لیجئے کہ کیا اس کی کوئی مثال آپ کے پاس موجود ہے۔ اگر اس کے حق میں کوئی واضح مثال موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں آپ کو بولنے کے بجائے چپ رہنا چاہیے۔ کیوں کہ تائیدی مثال کے بغیر اس قسم کے بیان کی کوئی علمی حیثیت نہیں۔

حیدرآباد میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس مضمون پر اعتراض کیا جو الرسالہ جون ۱۹۹۱ میں "زیادہ صحیح اصول" کے عنوان سے چھپا تھا، انھوں نے کہا کہ ہماری قوم کے پاس وہ شاندار نمونے ہیں جب کہ ایک شخص نے یہ کہہ کر جان دے دی کہ "شیر کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے" اب آپ قوم کو شیر کے نمونہ سے ہٹا کر گیدڑ کے نمونہ پر ڈال دینا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ شیر کا نمونہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیر کا نمونہ یہی ہے کہ حریف کے مقابلہ میں پسپائی اختیار نہ کرو بلکہ بے خوف ہو کر لڑ جاؤ۔ میں نے کہا کہ یہ شیر کا نمونہ نہیں، یہ تو کسی شاعر کی مضمون بندی ہے یا کسی خطیب کی لفاظی۔

میں نے کہا کہ میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔ مگر افریقہ اور ہندستان کے جنگلوں میں جو شیر رہتے ہیں، ان کی حقیقی فلم امریکہ کی جیوگریفیکل سوسائٹی نے کروروں ڈالر خرچ کر کے بنائی ہے اور وہ ٹی وی پر آتی رہتی ہے۔ اس کو میں نے تفصیل سے دیکھا ہے۔ آپ نے اگر نہ دیکھا ہو تو آپ بھی دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر انتہائی حد تک ٹکراؤ سے دور رہنے والا جانور ہے۔ شیر انتہائی

طاقت ور ہونے کے باوجود ہمیشہ ٹکراؤ کو اوائڈ کرنے کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف اس وقت اپنی طاقت استعمال کرتا ہے جب کہ عملاً اس کو زخمی کر دیا گیا ہو۔

اس فلم میں آپ دیکھیں گے کہ شیر چل رہا ہے۔ سامنے سے اس کو ہاتھی آتا ہوا دکھائی دیا تو اس نے اپنے راستہ کو بدل دیا۔ حتی کہ بھینسوں اور جنگلی کتوں سے بھی وہ کترا کر چلتا ہے۔ ہرن اور چیتل شیر کے پسندیدہ شکار ہیں۔ ایک بھوکا شیر شکار کے لیے نکلتا ہے۔ سامنے ہرنوں اور چیتلوں کا غول کھڑا ہوا ہے۔ مگر وہ کبھی غول پر حملہ نہیں کرے گا۔ وہ صرف اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ کسی جانور کو تنہا پالے۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ ایک شیر نے پانی کے کنارے شکار کیا۔ اس کے بعد اس کا شکار ایک مگرمچھ پکڑ کر لے جانے لگا۔ اس وقت شیر نے مگرمچھ سے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ حالانکہ شیر اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ ایک بار میں نے دیکھا کہ اس نے سوا سو کیلو کا ایک سانبھر اپنے منہ میں دبایا اور اسی طرح پکڑے ہوئے دریا کو پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔

شیر کا طریقہ یہ ہے کہ طاقت ہو تو تب بھی نہ لڑو۔ اور کچھ لوگوں نے شیر کے نام پر یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ طاقت نہ ہو تب بھی لڑ جاؤ۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی مین اسٹریم سے میں بھی الگ ہوں اور آپ بھی الگ ہیں ---

میں نے کہا کہ آپ اپنے بارہ میں جو بھی چاہیں کہیں مگر میں تو مسلمانوں کی مین اسٹریم سے بال برابر بھی الگ نہیں ہوں۔ میں تو عین ان کی مین اسٹریم میں شامل ہوں۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ بعض علماء پر تنقید کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تنقید کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی مین اسٹریم سے الگ ہو گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا اشرف علی تھانوی سیاسی معاملہ میں ایک دوسرے کے ناقد تھے مگر دونوں مکمل طور پر مسلمانوں کی مین اسٹریم میں شامل تھے۔

پھر میں نے کہا کہ مین اسٹریم کا مطلب، اہل سنت والجماعت کے مسلک میں شامل ہونا ہے۔ میں کسی بھی اختلاف کے بغیر اہل سنت والجماعت کے مسلک پر قائم ہوں۔ اس سے ذرہ برابر بھی میں الگ نہیں۔ البتہ کسی مقصد کے حصول کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے، اس میں بعض اوقات میں دوسروں سے اختلاف کرتا ہوں۔ اس قسم کا اختلاف بین جائز ہے۔ وہ ہمیشہ صحابہ، تابعین، محدثین،

فقہاء اور علماء کے درمیان جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔

مثال کے طور پر مجھے شاہ بانو تحریک سے اختلاف تھا۔ مگر یہ اختلاف اصل مسئلہ کے بارہ میں نہیں تھا بلکہ صرف طریق کار کے بارہ میں تھا۔ میرا کہنا تھا کہ ہماری تحریک کا رخ سپریم کورٹ کی طرف نہیں بلکہ مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی اصلاح کی طرف ہونا چاہیے۔ اسی طرح میں نے بابری مسجد تحریک کے معاملہ میں اختلاف کیا۔ یہاں بھی میرا اختلاف اصل مسئلہ کے بارہ میں نہ تھا بلکہ میرا کہنا یہ تھا کہ ہماری تحریک کا میدان سڑکوں کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں اپنی تحریک کو عدالت اور گفت و شنید کے دائرہ میں رکھ کر اسے غیر احتجاجی انداز میں چلانا چاہیے۔

۸ امئی ۱۹۹۲ کی صبح کو حیدر آباد سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۴۴۰ کے ذریعہ طے ہوا۔ صبح کو قیام گاہ پر فجر کے بعد مجھے نیند آگئی۔ نیند کھلی تو دیر ہوگئی تھی۔ جہاز کا وقت بالکل قریب آگیا تھا۔ اگر اندرون شہر سے چل کر ایرپورٹ پہنچنا ہوتا تو جہاز کا پانا مشکل تھا۔ مگر اس وقت میں حبیب بھائی کے بیگم پیٹ کے مکان میں ٹھہرا تھا۔ یہاں سے ایرپورٹ بذریعہ کار دو منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ چنانچہ وقت پر ایرپورٹ پہنچ گیا۔

اس اعتبار سے یہ مکان اچھا ہے کہ وہ ایرپورٹ کے بہت قریب ہے۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس قربت کی وجہ سے یہاں ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ بھی کافی سنائی دیتی ہے۔ یہی اس دنیا کا قانون ہے۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ ایک کانٹا شامل ہوتا ہے اور ہر کانٹے کے ساتھ ایک پھول۔

انڈین ایر لائنز کی میگزین سواگت کا شمارہ مئی ۱۹۹۲ جہاز کے اندر موجود تھا۔ اس کے چند مضامین دیکھے۔ ایک مضمون دبئی کے بارہ میں تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف واقعات درج تھے۔ ایک خاتون اپنے سفر کے دوران دبئی سے گزریں۔ وہاں انھوں نے اپنے بچوں کے لیے مختلف قسم کے تفریحی سامان خریدے۔ انھوں نے اپنے تین سالہ بچہ کو چاکلیٹ کے بہت سے پیکٹ دیے۔ اس کے بعد ان کا بچہ اپنے نرسری اسکول کے ایک ساتھی سے ٹیلی فون پر کہہ رہا تھا کہ تم میرے گھر پہ آؤ تو میں تم کو دبئی کے سندر چاکلیٹ دوں گا جو میری ممی دبئی سے لائی ہے:

You want to come to my house? I'll give you lovely chocolates from Dubai. My mummy went to Dubai and bought me the chocolate.

دوسرے بچے نے اپنے چمک دار کھلونوں کی خبر اپنے دوست کو دینے کے لیے اس کا نمبر لایا اور پُر
انداز میں ٹیلی فون پر کہا کہ میری ممی دبئی گئی تھی، اور وہاں سے وہ میرے لیے بہت سے کار اور ایک جہا
اور ایک جیپ خرید کر لائی ہے :

My mummy went to Dubai and she bought me so many cars, and a plane, and a jeep.

موجودہ زمانہ میں یہی حال تمام گھروں کا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے ان کے گھر
لذت اور تفریح کے تمام سامان جمع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بچے ہر وقت دنیوی تماشوں میں گم رہتے ہیں۔
گھر میں چاکلیٹ اور کھلونوں کا ماحول ہے۔ ہر گھر دنیا کی یاد دلانے کا کارخانہ بنا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں
بچوں کے اندر آخرت پسندی کا مزاج پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۹۲ کو صبح ۱۰ بجے ہمارا جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ اعلانات کے مطابق، اس کے
ہوا باز کیپٹن مصطفیٰ تھے۔ میرا خیال تھا کہ دہلی پہنچ کر ان سے ملاقات کروں گا۔ مگر جہاز جب اپنی منزل
پر پہنچتا ہے تو اترنے والوں کی عجلت کی وجہ سے جہاز میں ایک ہنگامی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
اس ہنگامہ میں ملاقات کی بات میرے ذہن سے نکل گئی اور میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

مسلمانوں کے ہر پرچہ میں مسلمانوں کی محرومیوں اور حق تلفیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر میں اس قسم کی
باتوں کو ناقابل ذکر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کوئی سماج اس قسم کے واقعات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جن چیزوں کو
محرومی یا حق تلفی کہا جاتا ہے وہ قدرت کا ایک سادہ قانون ہے جو ہمیشہ اور ہر انسانی آبادی میں جاری
رہتا ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر محرومی میں ہمیشہ یافت کے پہلو موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ انڈین ایرلائنز
کی اعلیٰ سروسوں میں مسلمان داخل ہو رہے ہیں۔ نئی اقتصادی پالیسی کے بعد کچھ مسلمانوں نے انٹرنیشنل
ایرکمپنی بھی بنائی ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسائل کو نظرانداز کیا جائے اور مواقع
کو بھرپور طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۸ مئی کو سفر سے واپس ہو کر دہلی پہنچا تو لاہور کے دو اخبار وفاق اور نوائے وقت (۱۷ مئی ۲
بذریعہ ڈاک ملے۔ دونوں کے صفحہ اول پر بھارت میں ہونے والے "مسلم کش فساد" کی خبر تھی، وفاق

"تعمیری صحافت کا پاسدار" ہے، اس کے صفحہ اول کی سب سے زیادہ جلی سرخی یہ تھی ——— "نئی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام، دار الحکومت فوج کے حوالے کر دیا گیا"۔

مانیٹرنگ ڈسک کے حوالے سے خبر میں بتایا گیا تھا کہ بھارتی حکومت مسلمانوں کے جان ومال کا تحفظ کرنے میں ناکام ہو گئی۔ ہندو بلوائی پولیس کی شہہ پر من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ مسلح انتہا پسند ہندوؤں نے اچانک مسلم علاقوں کا محاصرہ کر کے حملوں کا آغاز کر دیا۔ مسلمانوں کی املاک کو نذر آتش کر دیا گیا۔ مسلم آبادیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بھارت ایک مرتبہ پھر بدترین مسلم کش فسادات کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ خدشہ ہے کہ مسلم کش فسادات کی یہ مہم پورے بھارت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ نوائے وقت میں بھی اسی قسم کی خبر صفحہ اول پر شائع کی گئی ہے۔

اس سنسنی خیز رپورٹ میں جس مسلم کش فساد کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا "نئی دہلی" سے کوئی تعلق نہیں جہاں میں پچھلے دس سال سے رہ رہا ہوں۔ اس فساد کا تعلق نئی دہلی سے نہیں بلکہ جمنا پار کی ایک بستی سے ہے جس کو سیلم پور کہا جاتا ہے، اور ایک شخص کے بقول، جس کا زیادہ صحیح نام سلم پور ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ مذکورہ رپورٹ میں اس واقعہ کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس کا اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ نئی دہلی کے اخبار قومی آواز کے نمائندہ مسٹر نصرت ظہیر نے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرنے کے بعد قومی آواز کے شمارہ ۷ مئی ۱۹۹۲ میں مفصل رپورٹ چھاپی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فساد ایک مسلمان کی نادانی کی بنا پر پیش آیا۔ اس فساد کا اصل سبق یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہوش مندی کے ساتھ جینا سکھایا جائے نہ کہ خلاف واقعہ طور پر مذکورہ قسم کی خبریں چھاپ کر ان کے اندر فرضی خوف پیدا کیا جائے۔

پیرو یا پرستار

لکھنؤ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں نے اقبال پر تنقید کی۔ میں نے کہا کہ اقبال کا شعر ہے : لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ یعنی تم کمزور ہو تب بھی طاقت ور سے لڑ جاؤ۔ میں نے کہا کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ اس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔

مذکورہ مسلمان غصہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ اقبال پر تنقید کرتے ہیں۔ اقبال تو یہ تھے، اقبال تو وہ تھے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ اقبال کے پرستار ہیں مگر آپ لوگ اقبال کے پیرو نہیں۔ اگر واقعۃً آپ اقبال کے پیرو ہیں تو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب آپ کے پڑوس میں بابری مسجد کو توڑ کر اس کی جگہ مندر بنایا گیا تو اقبال کے مداحوں کو لے کر آپ کیوں نہیں اجودھیا میں گھس پڑے۔ آپ لوگ اگرچہ "مولا" تھے اور کارسیوک آپ کے مقابلہ میں "شہباز" تھے۔ مگر آپ کے اقبال تو یہی کہتے ہیں کہ تم خواہ مولا ہو، تب بھی تم شہباز سے لڑ جاؤ۔ آپ لوگ اجودھیا میں داخل ہو کر کارسیوکوں سے ٹکرا جاتے۔ اگر وہ لوگ آپ کو مار ڈالتے تب بھی آپ کامیاب تھے۔ کیوں کہ آپ کے محبوب اقبال نے کہا ہے :

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن   نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ "اکابر" کی تنقید پر غصہ ہوتے ہیں، ان کے غصہ کی حقیقت کیا ہے۔ یہ لوگ سب کے سب اپنے اکابر کے پرستار ہیں، وہ اپنے اکابر کے پیرو نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں جو واقعۃً اکابر کے کہے پر چل رہا ہو۔ البتہ اگر کوئی شخص ان کے مفروضہ اکابر پر کوئی نقد کر دے تو وہ بھڑک اٹھیں گے۔ ان کا یہ رویہ پرستاری کی بنا پر ہے، وہ پیروی کی بنا پر نہیں۔ اسلام میں "اکابر" کی کوئی کیٹگری نہیں۔ تاہم اگر کوئی شخص کچھ افراد کو اکابر کا درجہ دے تب بھی، اسلام کے مطابق، ان کی صرف پیروی جائز ہو گی، ان کی پرستاری کے لیے اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ لوگ اکابر کے پرستار ہیں، اسی لیے وہ اکابر کی تنقید پر غصہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اکابر کے پیرو ہوتے تو ہرگز ایسا نہ ہوتا کہ وہ اکابر کی تنقید پر بھڑک اٹھیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۲

۱ مسٹر یشونت دیش مکھ نے "لکھنؤ فیچرس" کے لئے ۱۰ ستمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ بہت تفصیلی انٹرویو تھا۔ اس کا تعلق زیادہ تر ہندو مسلم مسائل اور انڈیا کے مستقبل سے تھا۔ یہ انٹرویو ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے شمارہ ۸ اکتوبر ۱۹۹۰ میں چھپا ہے۔

۲ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کے ساتھی بے معنی اور سطحی مخالفتوں کے باوجود ہر جگہ مشن کا تعمیری کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً شانتی یاترا کے دوران ۱۹ دسمبر ۱۹۹۲ کو کچھ گھنٹے ناندیر میں گزارنے کا موقع ملا۔ یہاں حلقہ الرسالہ سے عمومی ملاقات نہ ہو سکی۔ تاہم کرفیو کے باوجود جناب جمال الدین صدیقی خطیب اور جناب محمد زین الدین قاضی ہوٹل میں آکر ملے۔ وہ الرسالہ مشن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ مقامی حالات معلوم ہوئے۔ اللہ کے فضل سے وہ اور ان کے ساتھی کچھ لوگوں کی مخالفت کے باوجود الرسالہ مشن کے کام کو سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اللہ کی توفیق سے انھوں نے اپنی زندگیاں اس دینی مشن میں پوری طرح لگادی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور تمام کارکنوں کی ہر طرح مدد فرمائے۔

۳ اورنگ آباد کی ایک تعلیمی اور رفاہی تنظیم "اورنگ آباد پیس ایسوسی ایشن" کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اورنگ آباد کا سفر کیا۔ ۴-۵ ستمبر ۱۹۹۳ کو وہاں چند پروگرام ہوئے جس میں خطاب کا موقع ملا۔ ۵ ستمبر کی شام کو "اسلام دین رحمت" کے موضوع پر تقریر کی۔ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، ہر مذہب کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴ ہندی اخبار نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اسرار خاں نے ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم لیڈرشپ اور مسلم سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کا مستقبل خود مسلمانوں کے اپنے عمل پر موقوف ہے۔ نہ کہ کسی ایک یا دوسری پارٹی کے رویہ پر۔

۵ انگریزی روزنامہ پائیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز احمد نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز

کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر "فسادی کی تاریخ" سے تھا۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات انھیں بتائی گئیں۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ "قضا" کا معاملہ فتوے کے معاملہ سے بالکل الگ ہے، ایک شخص کو قابل سزا مجرم قرار دینے کا فتویٰ کوئی مفتی نہیں جاری کر سکتا۔ اس قسم کے معاملہ کا تعلق عدالت سے ہے۔ عدالت میں ضروری کارروائی کے بعد ہی کوئی قاضی یا جج کسی مجرم کے لئے مقرر سزا کا اعلان کر سکتا ہے۔ خواہ اس کے جرم کا تعلق کسی مذہبی معاملہ سے ہو یا سماجی معاملہ سے۔ یہ انٹرویو پانیر کے شمارہ ۱۰ نومبر ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔

۶ صدر اسلامی مرکز نے ایک پروگرام کے تحت ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۳ میں اٹلی اور انگلینڈ کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں کانفرنس میں شرکت۔ خطابات اور ملاقات کا موقع ملا۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۷ ہندی اخبار نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اسرار خاں نے ۶ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانان ہند سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ انڈیا دوسرے ملکوں سے مختلف نہیں۔ مسلمان جس طرح دوسرے ملکوں میں وہاں کے حالات سے ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں اسی طرح وہ انڈیا کے حالات سے ایڈجسٹ کر کے رہیں تو یہاں بھی ان کو وہی شانتی مل سکتی ہے جو انھیں دوسرے ملکوں میں ملی ہوئی ہے۔

۸ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر فیروز نے ۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ کچھ مفتی صاحبان آجکل جس طرح کسی کے بارہ میں قتل اور پھانسی کا فتویٰ جاری کر رہے ہیں وہ سراسر غیر اسلامی ہے۔ کسی جرم پر سزا کا فیصلہ دینا قاضی کا کام ہے، وہ ہرگز مفتی کا کام نہیں۔ کوئی مفتی اگر کسی کو مجرم بتا کر اس کے لئے سزا کا فتویٰ جاری کرتا ہے تو وہ خود سب سے بڑا مجرم ہے۔

۹ پی ٹی آئی کے نمائندہ مسٹر اقبال نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر "تازہ حالات اور مسلمان" سے تھا۔ انھیں بتایا گیا کہ

اسلامی نقطہ نظر سے صرف یہ کافی نہیں کہ جو قدم اٹھایا جا رہا ہے وہ بظاہر صحیح ہے۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ مفید ہے یا مضر۔

ہفت روزہ نئی دنیا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر کرمانی اور ان کے ساتھیوں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع "اسلامی کورٹ" کے قیام کے بارہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا حالیہ فیصلہ تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ اس فیصلہ کا فائدہ کچھ خود ساختہ لیڈروں کو مل سکتا ہے مگر عام لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔

انگریزی روزنامہ پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسلمان کے اوپر شریعت نے کیا کیا ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اور حالات کے فرق سے ان ذمہ داریوں میں کس قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ انٹرویو پانیر کے شمارہ ۱۷ اکتوبر میں شائع ہوا ہے۔

کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں ۱۵ - ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ کو نیشنل سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع تھا: انڈین کلچر اینڈ نیشنل ہارمنی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۵ اکتوبر کے اجلاس میں شرکت کی اور "کی نوٹ ایڈرس" کے طور پر وہاں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک میں یک جہتی صرف ٹالرنس کے ذریعہ لائی جا سکتی ہے۔ اتحاد ہمیشہ اختلاف کو برداشت کرنے سے آتا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔

ہندی ہفت روزہ نئی زبین کے نمائندہ مسٹر کرمانی اور مسٹر شاہد نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ بابری مسجد کے مسئلہ میں جو فارمولا الرسالہ کی طرف سے دیا گیا تھا آج ہندو اور مسلمان دونوں عملی طور پر اس کو اختیار کر چکے ہیں۔

دوردرشن (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر حضرت بل کے حادثہ کے پس منظر میں مسجد کے اسلامی حکم کے بارہ میں تھا۔ اس انٹرویو کا سوال وجواب انگریزی زبان میں ہوا۔ ۱۹ اکتوبر اور ۲۰ اکتوبر کے پروگرام میں اس کو دوردرشن کے نیشنل چینل پر دکھایا گیا۔

Releasing in January 1994

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is n the very nature of things. But repeated emphasis on the darker ide of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead nly to discouragement, depression and inertia. The better way to nd solutions to the problems besetting us would be to seek out and ay stress on whatever opportunities present themselves, so that hose upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to ake the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on w, in entering upon the more positive avenues open to them, slims may avail themselves of the same kind of opportunities ght here in India as they would find at any other point on the obe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Pages 200; Size 14.5cm x 22cm

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو	
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسول	-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-
ڈائری جلد اول	-
ڈائری جلد دوم	-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-

انوار حکمت	-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
شخصیات اسلام	-
تعدد ازدواج	3/-

روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	7/-
صداقت اسلام	-
علماء اور دور جدید	8/-
ہندستانی مسلمان	7/-
سیرت رسول	-
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
اسلام کا تعارف	4/-
ہندی	
سچائی کی تلاش	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	6/-
پیغمبر اسلام	3/-
	3/-
عربی	
الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	-
منزل کی اور	
آڈیو کیسٹ	
A-1 حقیقت ایمان	25/-
A-2 حقیقت نماز	25/-
A-3 حقیقت روزہ	25/-
A-4 حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقت حج	25/-
A-6 سنت رسول	25/-
A-7 میدان عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحاد ملت	25/-
A-12 تعمیر ملت	25/-
A-13 نصیحت لقمان	25/-
A-14 متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15 متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16 متفرق سورتیں ۳	30/-
ویڈیو کیسٹ	
V-1 پیغمبر انقلاب	200/-
V-2 اسلام داعی امن	200/-
V-3 اسلام دور جدید کا خالق	-
V-4 امت مسلمہ اور جدید چیلنج	-
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	-
V-6 اسلام اور دور حاضر	-

God Arises	Rs 85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/.
Islam As It is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	-
Indian Muslims (Hb)	145/-
Indian Muslims (Pb)	55/-
Introducing Islam	-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	-
Islam the Creator of Modern Age	-
The Way of Find God	6/-
The Teachings of Islam	7/-
The Good Life	7/-
The Garden of Paradise	7/-
The Fire of Hell	7/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	6/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of Wisdom	-

فائل الرسالہ اردو (مجلد)	
سال 1982	100/-
1985	100/-
1986	100/-
1987	100/-
1988	100/-
1989	100/-
1990	100/-
1991	100/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)
1984 تا 1991 — 100/- فی جلد

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)
1990-91 — 100/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, NIZAMUDDIN WEST MARKET, NEW DELHI 110 013 Tel 4697333,

Delhi Postal Regd No. DL/11154/93